آفتابِ نو

احمد خان ابوبکر

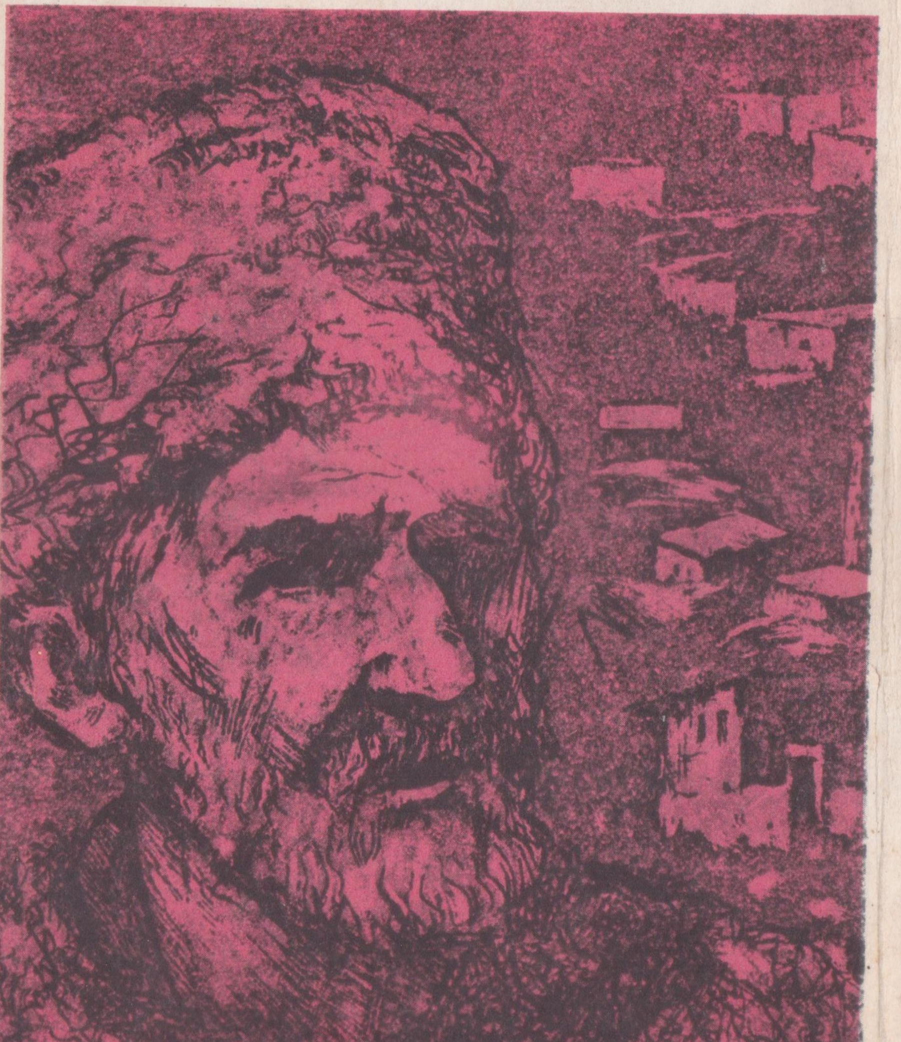

آفتابِ نو

احمد خان ابوبکر

(ناولٹ)

دارالاشاعت ترقی ۰ تاشقند شاخ

۱۹۸۱ء

ترجمہ: منظر سلیم
ڈیزائن: اناتولی لیگائی

АХМЕДХАН АБУ-БАКАР

СОЛНЦЕ В «ГНЕЗДЕ ОРЛА»

Повесть

На языке урду

A $\frac{70303—013}{014(01)—81}$ 725—81 4702 730200

پہلی اشاعت ۱۹۸۱ء
سوویت یونین میں شائع شدہ

© اردو میں ترجمہ، دارالاشاعت ترقی — تاشقند شاخ — ۱۹۸۱ء

عظیم آفتاب آسمان میں معلق ہے۔ اور کہستانی راستے پر بھی دو آفتاب ہیں، دو مسافر۔ ڈھلواں راستے پر دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ بوڑھا آدمی دھیرے دھیرے پہاڑ پر سے اتر رہا ہے اور ایک مستعد نوجوان تیزی کے ساتھ اوپر چڑھ رہا ہے۔

"یہ تم میرے سامنے فجائیہ نشان کی طرح کیوں ٹھہر گئے؟" بوڑھا جس کی کمر جھکی ہوئی ہے، پوچھتا ہے۔

"میں اپنی آواز بلند کرنا چاہتا ہوں، بزرگ محترم، ساری دنیا سے کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی کتنی شاندار چیز کا نام ہے!" وہ اپنے بازو فضا میں لہرا کے نیلگوں آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ "لیکن آپ، بزرگ محترم، سوالیہ نشان کی طرح کیوں جھکے ہوئے ہیں؟"

"میں اس دنیا سے پوچھنا چاہتا ہوں، میرے بیٹے کہ آخر زندگی اتنی بےانصاف کیوں ہے" بوڑھا اپنی لاٹھی سے راستے کو ٹٹولتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

"آفتاب زندہ‌باد میرے بزرگ!"

"ہاں، آفتاب زندہ‌باد میرے بیٹے!"

(اوراری کا داستان‌گو)

پہلا باب

جس میں "عقاب نشیمن" کے ان واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اگلے ابواب میں بیان کئے جانے والے واقعات سے بہت بعد میں لیکن آخری باب کے واقعات سے قبل پیش آئے تھے۔

بہار اور دھرتی کی خوشبو

بڑے بوڑھوں کا موسم بہار میں انتقال ہوتا ہے، یہ کہستانیوں کا کہنا ہے۔ ہاں، وہ موسم بہار میں دنیا سے کوچ کرتے ہیں۔ اور کیوں؟ اس لئے کہ بہار دھرتی کی عظیم‌الشان نئی زندگی ہے۔ یہ

بات سچ بھی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی۔ آپ اسے ثابت کرتے پھرئیے۔ آپ پوچھیں گے بھلا کس سے؟ آفتاب سے۔ لیکن آفتاب تو خاموش ہے، عالی ظرف ہے اور آپ اس سے اور کس چیز کا مطالبہ کر سکتے ہیں جبکہ وہ خود ہی، ہماری زندگی اور ہماری دانش کے تمام آغازوں کا آغاز ہے۔ آفتاب؟ جی ہاں، آفتاب۔

موسم بہار میں یا تو ہم آفتاب سے کچھ زیادہ قریب ہو جاتے ہیں یا وہ ہم سے۔ آفتاب زندہ ہے، سنہرا ہے، "چوریک" نامی اس کلچے کی طرح سرخ، جسے ابھی ابھی تنور سے نکالا گیا ہو، چوریک جس کے اتنے ہی ٹکڑے کئے جاتے ہیں جتنے کسی گھر میں بچے ہوتے ہیں۔ اور نان - کیا نان آفتاب نہیں ہے؟ کسی بچے کے چہرے پر مسکراہٹ اور رخساروں پر سرخی لانے والی چیز کیا ہے؟ اس کی آسمان کی طرح شفاف آنکھوں میں کون سی چیز چمک پیدا کرتی ہے؟ آفتاب کا ایک ٹکڑا - نان۔ اور کیا بچہ خود ہی مسکراتا ہے؟ جی نہیں، دراصل یہ آفتاب ہے جو بچے کے اندر سما کے مسرور ہوتا ہے۔ جی ہاں، آفتاب ہر جگہ ہے: اس مٹی میں جسے کوزہ گر گوندھتا ہے، شفتالو کے اس درخت میں جو دریچے کے پاس پھولوں سے لدا کھڑا ہے، بھینس کی پیٹھ پر بیٹھی ہوئی مینا کی آنکھوں میں اور تیز پہاڑی چشمے کی سرسراہٹ میں، ہر جگہ۔

آپ آفتاب کی طرف دیکھتے نہیں، آپ اسے محسوس کرتے اور سمجھتے ہیں اور آفتاب ہی کے متعلق فطرت اپنے ابدی نغمات گاتی ہے۔ ماں پالنے کے قریب لوریاں گاتی ہے، طائر گاتے ہیں، پھول، گھاس اور اشجار گاتے ہیں۔ لیکن آپ شک بھرے لہجے میں دریافت کرتے ہیں، کیا کوئی شجر بھی کچھ محسوس کر سکتا ہے؟ میں آپ سے کہتا ہوں: جی ہاں، کر سکتا ہے۔ شجر انسان کی فیض رساں نگاہوں کو محسوس کرتا اور اس کے ہاتھوں کے محبت بھرے لمس کو سمجھتا ہے۔ چرکیئی کے ایک شخص نے اپنا مکان، احاطے میں کھڑے ہوئے شفتالو کے شجر سمیت فروخت کر دیا تھا۔ درخت کو اس کا سخت ملال ہوا اور مرجھا کے رہ گیا۔ اس میں پھل آنے بند ہو گئے اور آخرکار وہ سوکھ گیا۔ اس کہانی کو تین سو سال قبل، "عقاب نشیمن" میں رہنے والے ایک شخص نے پتھر پر کندہ کر کے جاوداں کر دیا تھا اور اس کے بعد سے لوگ اس پر یقین کرتے چلے

آ رہے ہیں۔ لوگ مجموعی حیثیت سے قوم کی تشکیل کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کسی قوم سے کہیں ہزار سال میں جا کے ایک بار غلطی سرزد ہوتی ہے۔

آفتاب - ایک زبردست کھیت ہے جہاں پکے ہوئے گیہوں کی فصل کے بوجھ ڈھیر ہیں۔ اس کی سنہری شعاعیں اپنے محبت بھرے لمس سے ساری دھرتی کو، برف پوش کوہساروں تک کو حرارت پہنچاتی ہیں اور کوہسار، یہ شہ زور قلعے، اپنے پتھریلے پہلوؤں اور بوجھ سے لدی ہوئی پیٹھوں کے ساتھ دھوپ میں نہاتے ہیں۔ ان کی چوٹیوں پر برف پگھلتی ہے، گلیشیر آنسو بہاتے ہیں اور پگھلی ہوئی برف کے پانی کو شفاف دھارے پرشور، کیچڑ ساتھ لے کے بہنے والی کہستانی ندیوں میں انڈیل دیتے ہیں...

بڑے بوڑھوں کا موسم بہار میں انتقال ہوتا ہے، وہ اپنے پتھر کے دیہی گھروں میں موسم سرما کی سختیاں جھیلنے کے بعد، زندہ رہنے کی خواہش کو آخری بار محسوس کرتے ہوئے زندگی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ زندہ رہنا، زندہ رہنا، زندہ رہنا - بوڑھا دل، اریلی پہاڑی پر چلنے والی اس گاڑی کی طرح جس کے پہیوں میں تیل نہ ڈالا گیا ہو، چوں چوں کی آواز نکالتا ہے۔ انسان کا دل بھی جل کے آفتاب کی طرح نور پھیلا سکتا تھا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں: بھلا کسی دل کو آفتاب سے کیسے تشبیہ دی جا سکتی ہے؟ میرا کہنا ہے کہ کیوں نہیں دی جا سکتی جبکہ ایک انسانی زندگی کی قیمت صرف آفتاب ہی نہیں بلکہ مخفی اور غیرمخفی، تمام رازوں سمیت ساری کائنات کے برابر ہے۔

بڑے بوڑھوں کا موسم بہار میں انتقال ہوتا ہے۔ کوئی چاہے تو اس بات پر شک کر سکتا ہے لیکن ہمیں چرکیئی گاؤں کے قبرستان میں جہاں سے بھٹک کے اندر آ جانے والے ایک بیل کو ایک معمر کوہستانی لعنت بھیجتے ہوئے اس وقت باہر بھگا رہا ہے، قبروں کے پتھروں کی پرچھائیوں کو چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ بیل کے مالک کی لوگ یقیناً سرزنش کریں گے۔ دیکھئے نا، مسنی - تسربی پہاڑی کے دامن میں جہاں چونے کے برہنہ پتھروں پر قوس قزح کے سارے کے سارے رنگ ایسا لگتا ہے کہ نقش اور پتھروں کا جزو ہو کر رہ گئے ہیں، کتنے ہی سنگ مزار اداسی سے خیالوں میں کھوئے

ہوئے کھڑے ہیں! قبرستان خاموش اور مقدس جگہ ہے۔ یہاں کوئی بھی شخص اپنی آواز اونچی نہیں کرتا، آوازوں میں گھرے جذبات کی تھرتھراہٹ ہوتی ہے اور آپسی بحثیں ناشائستہ معلوم ہوتی ہیں۔

آج چرکیئی کے قابل احترام بڑے بوڑھے ایک ایسے شخص کو دفن کر رہے ہیں جس کی سبھی عزت کرتے تھے۔ آج کے دن جو موسم بہار کے ابتدائی گرم دنوں میں سے ایک ہے، جبکہ آفتاب کی مہربان شعاعیں ہر زندہ شے کو محبت سے سہلا رہی ہیں اور گھاس کی ریشم جیسی نرم کونپلوں میں نئی تازگی کی کسمساہٹ ہے، جبکہ اشجار میں جو ابھی تک بےبرگ ہیں، پھول کھل رہے ہیں اور ڈھلانوں پر اوائل بہار کے سفید پھول‌دار پودے یوں بکھرے ہوئے ہیں جیسے سرخ بالوں والے کسی شریر لڑکے کے چہرے پر انھوریاں، دنگیر — دنگارچو زندگی سے رخصت ہو گیا ہے۔ وہ ابھی اسی برس کا بھی نہیں ہوا تھا اور ان بےدرد کوہساروں میں اس کا دل باقاعدگی سے دھڑکتا رہتا تھا۔ لوگوں کا جلدی انتقال ہونے لگا ہے، یہ بات گاؤں سوویت کی چیرمین، نوجوان سلطنت نے جو خود بھی کہستانی عورت ہے، مقامی ریڈیو پر لوگوں کو اس المناک واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے شدت غم سے کانپتی ہوئی آواز میں کہی۔

قبرستان میں موسیقی کا انتظام نہ تھا کیونکہ موسیقی ایسے مواقع پر بےمحل تصور کی جاتی ہے۔ موسیقی آفتاب ہے اور آفتاب — موسیقی۔ آفتاب خاموش ہے اور موسیقی کو بھی غم کی خاموشی کو برقرار رکھنا چاہئے۔ کوہساروں میں لوگ اس بات کو یونہی سمجھتے ہیں۔

عورتوں کا قبرستان آنا بھی نازیبا تصور کیا جاتا ہے۔ انہیں دنیا سے رخصت ہونے والے کا سوگ اس کے گھر میں گریہ و ماتم کے ذریعے منانا چاہئے۔

رواج کوہساروں میں توڑے نہیں جا سکتے: آپ قبرستان میں پاپاخا* پہن کے جاتے ہیں۔ عام ٹوپی ناقابل قبول ہوتی ہے اور عام

---

*داغستان کے پہاڑی علاقوں کی اونچی ٹوپی۔ اڈیٹر۔

ہیٹ تو اس سے بھی زیادہ نامناسب تصور کی جاتی ہے۔ کوئی بھی معقول شخص انہیں پہن کے نہیں جاتا اور برہنہ سر جانے کا تو خیر سوال ہی نہیں اٹھتا۔ محمود ایسن‌بائیف کی مثال سامنے ہے، وہ تو ڈائس پر بھی اپنی پاپاخا نہیں اتارتا۔ دراصل پاپاخا آن‌بان اور وقار کی علامت ہے۔

"ٹوپیاں تو دوسرے عقیدے کے لوگ پہنتے ہیں۔"

"اور بوٹ؟ وہ بھی تو زمانۂ قدیم میں نہیں پہنے جاتے تھے۔"

"بوٹوں کی بات مختلف ہے۔ انہیں تو پیروں میں پہنا جاتا ہے لیکن سر بہرحال سر ہے۔"

اس لئے آج قبرستان میں بہت سی پاپاخائیں دکھائی دے رہی ہیں۔ پاپاخا اور پوستین، کہستانی کوٹ "بیش‌میت" اور جیکٹ، لانگ بوٹ اور عام بوٹ۔ رات میں ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی اور آج آسمان شفاف ہے، کہیں غبار کا ایک ذرہ تک نظر نہیں آتا جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نیک آدمی تھا۔

دنگیر — دنگارچو کو جس قبرستان میں دفن کیا جا رہا ہے وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود گاؤں۔ گاؤں کے لوگ خاموش ہیں لیکن ہر ایک کے ذہن میں بھاری پتھروں جیسے وزنی خیالات منڈلا رہے ہیں:

"آفتاب ایک انسان سے اور ایک انسان آفتاب سے محروم ہو گیا... زندگی میں یونہی ہوتا ہے۔"

"میرے اوپر ان کے سینتیس روبل قرض ہیں۔ کیا ان کے خاندان والوں کو اس کا علم ہے اور کیا وہ کوئی وصیت چھوڑ گئے ہیں؟"

"تدفین کے بعد کی ضیافت کے لئے ایک بیل ذبح کیا گیا ہے۔ کھال کسے ملے گی؟"

"انہیں زندگی میں ہلکا بوجھ نہیں برداشت کرنا پڑا۔ یہ بوجھ ایسا تھا کہ اسے جھیلنے کے لئے تین زندگیوں کا عرصہ درکار تھا..."

"اوہ، اس سے جانے کتنے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ جنت میں تو جانے سے رہا۔ یقیناً دوزخ کی آگ ہی میں جلتا رہےگا۔"

"ارے، کمیونسٹ تھا، اس نے میرے دادا کو امیر کاشتکار

کہہ کے ان کو بےدخل کر دیا تھا۔ خدا اس کی اولاد کو ہمیشہ کے لئے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکے!"

"الوداع دنگیر — دنگارچو..."

"ہم سب فانی ہیں۔ کوئی بھی ہمیشہ زندہ رہنے والا نہیں... لیکن یاد؟ نیک انسان کی یاد اس وقت تک باقی رہےگی جب تک لوگ زندہ رہیں‌گے۔"

گاؤں خود اپنی فکروں میں الجھا ہوا ہے: عورتیں چشمے پر کپڑے دھو رہی ہیں، کہیں کوئی کتا بھونک رہا ہے، ٹرکوں کے انجن غرا رہے ہیں اور اسکول کے احاطے سے بچوں کے قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ ہر گھر کی چھت پر بھورا دھواں سیدھا اوپر ابھرتا اور بلندی پر جا کر بکھرتے ہوئے ہلکی شفاف نیلاہٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بہار اس نرم اور نم مٹی کی طرح مہک رہی ہے جسے کلیل کرتے ہوئے کسی بیل نے پرمسرت انداز میں اپنی سینگوں سے فضا میں اچھال دیا ہو۔

گاؤں کے معزز بڑے بوڑھوں کے خود اپنے غیرنوشتہ قوانین ہیں اور جب سلطنت نے ایک تعزیتی تقریر تیار کی جس میں مرنے والے کے کارناموں اور اوصاف پر روشنی ڈالی گئی تھی تو انہوں نے اس سے کہا: "تم گاؤں سوویت کی چیرمین ضرور ہو لیکن کسی عورت کے لئے قبرستان جانا نازیبا بات ہے۔ خاص طور سے اس لئے اور بھی کہ دنگیر — دنگارچو کی آخری خواہش جس کی بےچون و چرا تکمیل کی جانی چاہئے، یہ تھی: "تقریریں نہ ہوں!" ہاں، مرنے والے کی وصیت یہی تھی۔ "تقریریں نہ ہوں!" اس نے یہ بات پورے ہوش و حواس اور صاف ذہن کے ساتھ کہی تھی کیونکہ بڑے بوڑھے زندگی سے رخصت ہوتے وقت بےہوش نہیں ہوتے۔ وہ تو محض واماندگی کا شکار ہوتے اور اپنی آرام‌گاہ کو چلے جاتے ہیں۔ اس کی یہ خواہش محض اس وجہ سے نہیں تھی کہ اب تک کسی کی تدفین کے موقعے پر کسی شخص نے، جیسا کہ غم کے مارے ہوئے آدمی کو چاہئے، کاغذ کے بغیر یونہی دل میں امنڈنے والے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا، محض اس وجہ سے بھی نہیں کہ وہ خود

قبرستان میں تقریریں سننے اور کرنے کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا، بلکہ یقیناً اس وجہ سے بھی کہ وہ جانتا تھا کہ ایسے لمحے میں کوئی بھی بات خاموشی کا بدل نہیں ثابت ہو سکتی۔ خاموشی کسی بھی تعریفی تقریر سے بہتر ہوتی ہے۔

چنانچہ صرف کانا چنتارئی اپنے موٹے موٹے، چٹخے ہوئے ہونٹوں کو جنبش دے کے دعا کے انداز میں کچھ بڑبڑایا۔ ویسے کون جانے شاید وہ مرنے والے پر لعنت بھیج رہا ہو کہ اس نے اتنے خوبصورت دن کو برباد اور لوگوں کے موڈ کو خراب کر دیا کیونکہ ہر موت ہمیشہ غلط وقت پر آتی اور بہت زیادہ مصیبت ساتھ لاتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اب اس کے دل میں کیا تھا خاص طور سے اس بات کے پیش‌نظر کہ چنتارئی نے مقدر کی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد تدفین کے مواقع کے مراسم انجام دینے کا کام اپنے ذمے لیا تھا۔ لیکن شاید اس کے خیالات قابل احترام تھے۔

"الوداع دنگیر — دنگارچو۔ آپ ہمارے دوست تھے..."

چنتارئی نے جو اس وقت پریشان بالوں والے فیل مرغ سے ملتا جلتا نظر آ رہا تھا، تانبے کا ایک برتن لے کے تازی قبر پر پانی چھڑکا اور اس طرح پاپاخائیں پہنے ہوئے لوگوں کو اطلاع دی کہ اب وہ قبرستان سے جا سکتے ہیں: "الوداع دنگیر — دنگارچو۔"

دنگیر — دنگارچو کی قسمت عام لوگوں کی جیسی تھی اور اپنی عمر کے مردوں میں کسی بھی لحاظ سے امتیازی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایک سرخ چھاپہ‌مار رہ چکا تھا۔ اور ان دنوں جبکہ کوہساروں کے بیٹے آفتاب تلے اپنے مقام کے حصول کا مطالبہ لے کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، سرخ چھاپہ‌مار کون نہیں بنا تھا۔ پھر سوویت اقتدار کے مستحکم قیام کے بعد وہ گاؤں میلیشیا کا رکن بن گیا۔ لکڑی کے پستول‌دان میں مازر پستول لے کے چلنے لگا اور اس نے مکئی کے کھیتوں میں لٹیرے بوتوگائی کو جو خود اس کا دور کے رشتے کا بھائی تھا، ہلاک کر دیا۔ ان‌تسوخ بلندیوں پر اس نے قیت‌مس علی‌خانوف کو اپنے تینوں بیٹوں سمیت ہلاک ہوتے دیکھا۔ علی‌خانوف بہت ہی غضبناک اور ظالم دشمن تھا لیکن اس نے شایان شان انداز میں موت کا سامنا کیا اور اپنے تینوں بیٹوں کو بھی جو اس کا سلسلۂ نسب چلانے والے تھے، اپنے ساتھ لے گیا...

دنگیر — دنگارچو نے اجتماعی فارم کو منظم کیا اور خود اپنے گھر کو اس کے دفتر کے طور پر استعمال کیا۔ وہ اس عظیم‌ترین جنگ میں جو فسطائیوں کے خلاف سوویت لوگوں کی آزادی کی جنگ تھی، سپاہی رہ چکا تھا۔ دنگیر — دنگارچو چالیس سے زائد برسوں تک کمیونسٹ رہا تھا۔ کیا یہ سب باتیں ان لوگوں کو یاد نہیں ہیں جنہیں اب قبرستان سے جانے کی عجلت ہے؟ انہیں ضرور یاد ہیں۔ وہ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے اس کے ساتھ زندگی بسر کی تھی، کام کیا تھا، بحث مباحثہ کیا تھا، لڑے جھگڑے تھے اور بعد میں لذیذ کھانے "خنکال" پر صلح کر لی تھی۔ بہت سی باتیں واقع ہوئی تھیں، اس آفتاب تلے بہت کچھ پیش آیا تھا۔ زندگی ایسی ہی چیز ہے۔

دنگیر — دنگارچو کو سب سے زیادہ قریب سے جاننے والا اس کا ساتھی اور پرانا دوست عشورعلی ہے۔ یہ رہا وہ معمر شخص، سفید مونچھیں، پیر کبیر جیسی داڑھی اور قراقل کی پاپاخا سر پر اتنے نیچے تک ٹھنسی ہوئی کہ اس کے کان نمایاں طور پر الگ نظر آ رہے ہیں۔ وہ ایک پرانا کہستانی کوٹ "بیش‌میت" پہنے ہوئے ہے جو ہاتھ سے بنے ہوئے کھردرے کپڑے سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے لانگ بوٹوں پر کافی دنوں سے پالش نہیں کی گئی... سب سے اہم بات یہ کہ اس کا چہرہ کسی چٹان سے تراشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا اندر کو دھنسی ہوئی انتہائی تیز نگاہوں والی آنکھیں، جیسے چٹان کے نیچے دو آشیانے، کھردری ٹھڈی جس کے آر پار زخم کا ایک نشان، کھوکھلے، چپکے ہوئے رخسار اور خاصے نمایاں ہونٹ۔ مجموعی حیثیت سے اس کی شکل و صورت اور وضع قطع سے کردار کی شرافت جھلکتی ہے جس میں ایسے شخص کی ایک خاص تیکھی صاف‌گوئی کا عنصر بھی شامل ہے جسے مقدر نے لوگوں کی رہنمائی کرنے، انہیں ہدایات دینے پر مامور کیا ہو۔

معمر عشورعلی سوچ رہا ہے: بڑی عجیب بات ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آدمی خود کو اس حالت میں پاتا ہے کہ لوگ اسے بار بار اس چیز کا احساس دلاتے ہیں جسے وہ مدتوں سے اپنی سفید مونچھوں کی نوکوں کی طرح جانتا رہا ہے... آخر لوگ آدمی کو مسلسل فرض، آن بان اور ضمیر کی یاد دہانی کیوں کرا رہے ہیں۔

اور یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ کوئی فریبی شخص اکثر ایمانداری کا، نشے میں دھت رہنے والا اکثر عقل و ہوش کا درس دیتا ہے۔ جس شخص نے کبھی ہل کی مٹھیا نہیں پکڑی وہ دوسروں کو بتاتا ہے کہ زمین کس طرح جوتی جانی چاہئے۔ جس نے کبھی گھوڑے کے لگام تک نہیں لگائی وہ ہر شخص کو بتا سکتا ہے کہ سواری کیسے کی جانی چاہئے۔ یہ سب لوگ اس نوعیت کی باتیں بڑے فخریہ انداز میں کہتے ہیں، بڑے بھولےپن سے انتہائی معمولی صداقتوں کے حوالے دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنے فکری افلاس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو اپنی کندذہنی پر بھی شرم نہیں آتی... ایک بار ایک عوامی شاعر کا جو عشورعلی کا دور کا رشتےدار تھا، انتقال ہو گیا اور لوگ تین گھنٹے تک کوئی گاڑی تلاش کرتے رہے جس پر میت کو خود اس کے گاؤں لے جایا جا سکے۔ لیکن ایک اور شخص کا بھی انتقال ہوا جسے سب لوگ حقارت کے ساتھ "دغاباز اور تیز چال‌باز" کہا کرتے تھے اور فوراً ہی متعدد ٹرک جا کے اس کے مکان کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے... یہ کیا ہے؟ آخر آدمی اس بات کو کس طرح سمجھے؟ لیکن آفتاب ایسی باتوں کو برداشت کر لیتا ہے۔ آفتاب عالی ظرف ہے۔ وہ دنیاوی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا... یہ سب ٹھہرے تلخ اور وہ بھی بعض اوقات متضاد نوعیت کے خیالات، ان کا اظہار صاف صاف اس طرح کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کسی کو برا نہ لگے... آخر یہ ہے کیا؟ بیماری، آفتاب کے چہرے پر سیاہ دھبے یا شاید کمزوری؟ جہنم میں جائے یہ سب۔ اس سب کو شیطان کی دم کے نیچے ڈھکیل دو، اپنی روح کو سکون دو اور اس سب سے بلند ہو جاؤ... لیکن کیا یہ طرزعمل بہتر ہوگا؟ نہیں! کوئی وحشی درندہ تک اپنے غصے کو نہیں چھپاتا۔ غراتا، دانت دکھاتا اور اپنے پنجوں کو باہر نکال دیتا ہے۔ مگر تم تو انسان ہو۔ تمہیں تو آفتاب کی طرح عالی ظرف ہونا اور معاف کرنا سیکھنا چاہئے..."

آفتاب بلند آسمان سے ہر ایک پر یکساں انداز سے نور کی بارش کرتا ہے۔

الوداع، دنگیر — دنگارچو...

ابھی گزشتہ رات ہی کو تو بڑے بوڑھے بیمار دنگیر — دنگارچو کے متعلق بتا رہے تھے کہ وہ دوپہر تک، جبکہ آفتاب نصف‌النہار پر

هوتا هے، زنده ره گیا تو آئنده موسم بهار تک زنده رهےگا لیکن وه تو طلوع آفتاب کے وقت تک بھی زنده نه رها۔

قبرستان سے چلتے وقت لوگوں نے مرنے والے کے عزیزوں کے هاتھ اپنے هاتھوں میں لے کے دبائے اور هر ایک نے چند الفاظ کہے:

"دعا هے که وه سال جو دنگیر – دنگارچو کی عمر میں نهیں شامل هو سکے، تمهارے اور تمهارے خاندان کے افراد کی عمروں میں شامل هو جائیں۔"

"تمهاری صحت کچھ اور اچھی هو۔"

"اچھی خبروں سے تمهارے گھر کی دهلیز روشن هو۔"

"تمهاری ساری امیدیں بر آئیں۔"

"تمهیں بار بار مسرت نصیب هو۔"

"آفتاب تم پر نور بکھیرتا رهے۔"

عشورعلی بھی اپنے تینوں بیٹوں میں سب سے چھوٹے بیٹے مراد کے ساتھ مرنے والے کے عزیزوں کے سامنے سے گزرا۔

باپ اور سب سے چھوٹا بیٹا

عشورعلی کو کهستانی گاؤں چرکیئی کے بڑے بوڑھوں میں سب سے زیاده عزت حاصل تھی۔ دراصل کوئی معاملے کی گهرائی میں جاتا تو پته چلتا که وه عمر کے اعتبار سے بعض دوسرے بزرگوں سے چھوٹا تھا لیکن اس نے کسی نه کسی طرح خود کو معمرترین شخص تسلیم کرا لیا تھا اس لئے اس کی باتوں پر کبھی بھی شک نهیں کیا جانا چاهئے تھا۔ عشورعلی اپنی ساری فکری زندگی میں سخت کهستانی قوانین کا علمبردار رها تھا اور آبا و اجداد کی غیرنوشته رسوم اور روایات کو مقدس اور ناقابل ترمیم تصور کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے: سب سے بڑا جو خود پوتے والا تھا، ایک جهاز کا کپتان تھا۔ دوسرا فوج سے وابسته اور آرکٹک منطقے میں مامور تھا۔ سب سے چھوٹا، مراد جس سے عشورعلی بهت زیاده محبت کرتا تھا، طویل قامت، کشاده شانوں اور اپنی ماں کے چهرے سے بهت زیاده ملتے جلتے نیک اور شریف چهرے کا مالک تھا اور جمهوریه

کے دارالخلافه مخاچقلعه میں رهتا اور کام کرتا تھا۔ وه هواباز تھا اور کهستانی علاقوں میں هر موسم میں هیلیکاپٹر اڑانے میں مهارت کے باعث شهرت حاصل کر چکا تھا۔ ایک بار زبردست برفباری کے باعث سڑک پر پھنس کر ره جانے والے کچھ افراد کو وه اپنے هیلیکاپٹر کی مدد سے نکال لایا تھا۔ اس موقعے پر اخبارات میں خوب تعریفیں هوئی تھیں۔ اسے تمغۂ اعزاز بھی ملا تھا۔ بس ایک بات خراب هو گئی تھی اور وه یه که اس کی شادی ناکام ثابت هوئی تھی۔ بیوی ایک پرچه چھوڑ کر چلی گئی تھی: "مجھے معاف کر دیجئے۔ کیا کروں، زندگی سے متعلق هم دونوں کے خیالات بهت مختلف هیں..." حالانکه لوگ کها کرتے تھے که وه دونوں ایک دوسرے کے لئے بهت موزوں هیں اور انهیں خوش‌قسمت تصور کیا کرتے تھے۔ مراد کے لئے یه خیال تسلی‌بخش تھا که ان کے بچے نهیں هوئے تھے کیونکه اس کے لئے اپنے بچوں کی جدائی ناقابل برداشت ثابت هوتی۔

وه گزشته شام کو کسی سے ملنے کی امید میں جسے مقدر نے غیرمتوقع طور پر اسے عطا کر دیا تھا اور جسے وه جان سے زیاده عزیز رکھتا تھا، گاؤں آیا تھا لیکن باپ نے جسے بیٹے کی آمد کا اصل سبب معلوم نهیں تھا، اس کا شکریه ادا کیا که وه دنگیر – دنگارچو کو الوداع کهنے کے لئے عین وقت پر گاؤں آ گیا تھا۔

"آپ نے قدیم رسوم کے تحت ان کی تدفین کر کے غلطی کی" مراد نے تلخی سے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس نے قبرستان کی دیوار پار کر لی اور فوراً هی اپنے باپ کی پرانی پاپاخا سر سے اتار ڈالی۔ "نیا قبرستان تو موجود هے..."

"ٹھهرو، ذرا مجھے اپنا هاتھ دو اور دیوار پار کرنے میں مدد کرو" عشورعلی نے کها۔ اس کے دائیں هاتھ میں کارنیل* کی لکڑی کا ایک گرهدار ڈنڈا تھا جسے اس نے بڑے بوڑھوں کے گدےکن** میں بیٹھ کے اطمینان سے باتیں کرتے هوئے چاقو سے چھیل چھیل کے چکنا اور خوبصورت بنایا تھا۔ "هر چیز اسی طرح هوئی جس طرح هونی چاهئے تھی۔"

* ایک قسم کا درخت جس کا پھل زیتون کے برابر اور اس سے مشابه هوتا هے۔ اڈیٹر۔

** بڑے بوڑھوں کے اکٹھا هونے کی جگه۔ اڈیٹر۔

"نہیں اباجان، یہ سب غلط ہوا!" مراد نے پیشانی پر شکنیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"الوداع، دنگیر — دنگارچو" عشورعلی نے مڑتے ہوئے کہا۔ اس کی پسندیدہ کہاوت یہ تھی: "لوگ کہتے ہیں کہ کانا بدقسمت ہوتا ہے لیکن نابینا شخص کانے پر بھی رشک کرتا ہے"۔

"اور آپ یہاں سے یہ احساس لئے ہوئے چل رہے ہیں کہ آپ نے اپنا فرض خوش‌اسلوبی سے انجام دے دیا؟"

"اس کی آخری خواہش تھی کہ اسے یہیں دفن کیا جائے! تمہیں میری بات پر یقین نہ آئے تو امیرخان یا لنگڑے عثمان سے پوچھ لو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا کیسے..."

"اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکول کو وہاں منتقل کرنا کیسے ممکن ہو گیا" بوڑھے نے ڈنڈے کو گھما کے بغل میں کہیں ایک طرف اشارہ کیا۔ "اور بچوں کو یہاں، گاؤں میں نہیں پڑھنے دیا گیا۔ اور وہ لوگ دوکانیں بند کر رہے ہیں..."

"یہ تو کرنا ہی تھا۔ گاؤں کو ایک نئی جگہ منتقل ہونا ہے۔"

"لیکن فی‌الحال یہاں لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں، گایوں کا گلہ نہیں۔ یہ لوگ جی رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔ الوداع دنگیر — دنگارچو۔"

"میں تو قطعاً نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ دنگیر — دنگارچو نے مرتے وقت اس طرح کی درخواست کیسے کی ہوگی۔"

"تمہیں اس کا یقین نہیں، تم اپنے باپ کی بات پر یقین نہیں کرتے؟"

"وہ تو سلاتاؤ کے ابتدائی کمیونسٹوں میں سے ایک تھے۔"

"ہاں... وہ میرا دوست تھا، بزدل نہیں تھا۔ ۱۹۱۹ء میں ہم نے اراکان میں ساتھ ساتھ لڑائی میں حصہ لیا تھا جبکہ غداروں کی ایک ٹولی نے بڑی چالاکی سے ہم پر ضرب لگائی تھی۔ وہ انقلابی کمیٹی کا ممبر تھا اور بعد میں گاؤں سوویت کا پہلا چیرمین ہوا تھا۔ گزشتہ جنگ عظیم میں ہم دونوں قرا قرائیف گھڑسوار دستے میں رضاکارانہ طور پر ساتھ ساتھ شامل ہوئے تھے۔ کارپیتھیا کے پہاڑوں میں ہم دونوں ایک ہی گولے کے پھٹنے کے بعد اس کے ٹکڑوں سے زخمی ہوئے تھے۔ چالیس برسوں تک بلکہ اس سے زائد مدت وہ

کمیونسٹ رہا لیکن مرتے دم اس نے مجھ سے دعا مانگنے کو کہا..."

"میرا خیال ہے کہ آپ کو اس طرح کا موقع پا کے مسرت ہوئی ہوگی؟"

"ارے چھوکرے، اپنے باپ سے باتیں کرتے وقت ذرا زبان سنبھالے رہو! دوست دم توڑ رہا ہو تو کسی کو بھی مسرت نہیں ہوتی اور ہم نے تو ساتھ ساتھ ہزار بار موت سے آنکھیں چار کی تھیں" بوڑھے نے بیٹے پر ناپسندیدگی کی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہمیں حملہ کرنا ہوتا تھا تو وہ سب سے پہلے خندق سے نکل کر دشمن پر ٹوٹ پڑتا اور میں اس کے ٹھیک پیچھے ہوتا تھا کیونکہ میرا دوست مجھے آواز دیتا تھا۔"

"اور ان کا جیسا آدمی پیچھے ہٹ گیا.."

"چپ رہو!"

"اباجان، مینار کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، وہ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کو نہیں روک سکتا۔ آپ اسے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ جو موگی‌کن قبیلے کے آخری نمائندے ہیں..."

"اور یہ تم مجھے کہہ رہے ہو؟ شکریہ، میں موگی‌کن نہیں ہوں، تمہاری اطلاع کے لئے بتا رہا ہوں کہ میں کتاگن قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"آپ سمجھ نہیں پا رہے ہیں کیا؟ ہم چاہیں یا نہ چاہیں نیا نظام آ کر رہےگا۔ یہ ٹریکٹروں کی گھڑگھڑاہٹ، کرینوں کی جھنکار، کارخانوں کے سائرن، بھاری ٹرکوں کی چیخ پکار اور ڈیزیل آئیل کی مہک کے ساتھ آ کے رہےگا۔ یہ ہائی والٹیج برقی لائنوں کے آہنی کھمبوں کے ذریعے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہزاروں گھاٹیوں اور ہزاروں بلندیوں سے ہو کے آگے بڑھےگا۔ اباجان، آپ اپنے چاروں طرف دیکھئے، کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"نہیں نہیں، دنگیر — دنگارچو نے نمایاں طور پر اس کی مخالفت کی۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ اسے نئی جگہ دفن کیا جائے..." عشورعلی نے سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا جیسے اسے اپنے بیٹے پر طنز کر کے، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، واقعی ایک طرح کی فتحمندی کا احساس ہو رہا ہو۔ اس کی آنکھوں

سے کینہ‌ورانہ مسرت سی جھلکتی معلوم ہو رہی تھی اور مراد نے اپنے باپ کی طرف نہایت ہی بےلاگ نگاہوں سے دیکھا۔ ان کی نگاہیں ٹکرائیں اور یہ کوئی نیک شگون نہ تھا۔

"اباجان، کیا یہ سچ نہیں کہ چونکہ آپ نے کسی نہ کسی طرح اپنے دوست کو اس کی زندگی کے آخری لمحات میں اس کے راستے سے ہٹا دیا اس لئے آپ بےحد مسرور ہیں؟"

یہ بات واقعی بڑی جسارت سے کہی گئی تھی۔ بوڑھے کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ تیوریوں پر بل پڑنے کے عمل میں اس کی بھویں ایک دوسرے سے قریب آ گئیں اور اس کی آنکھوں پر کچھ یوں آگے کو نکل آئیں جیسے کسی چٹان کے کنارے پر کائی۔ اس کے جبڑوں کے پٹھے تن گئے: وہ کب سمجھتا تھا کہ اس کا بیٹا ایسی بات بھی کر سکتا ہے۔ پل بھر کے لئے وہ بالکل بےقابو ہو گیا اور اس نے کپکپاتے ہاتھ سے ڈنڈے کو دھمکی‌آمیز انداز میں بیٹے کے سر پر بلند کیا۔

"اباجان، آپ اس کی ہمت بھی نہ کریں!.." مراد نے جلدی سے بازو اوپر اٹھایا لیکن خاصی تاخیر ہو چکی تھی اور ڈنڈا تکلیف‌دہ طور پر اس کے سر پر آ پڑا۔

"آپ نے یہ کیوں کیا؟"

"تمہیں یہ شک کرنے کی ہمت کیسے پڑی کہ تمہارا باپ نازیبا طرز عمل اختیار کر سکتا ہے؟"

"اباجان، خاموش ہو جائیے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں" مراد نے کسی گرم چیز کو ٹپک کے اپنے رخسار پر آتے محسوس کیا۔ اس نے سر پر زخم کو چھوا، ہاتھ ہٹایا اور ہتھیلی پر خون دیکھا۔ "میں نہیں سمجھتا تھا کہ آپ ایسا بھی کر سکتے ہیں..."

"تو سمجھنا سیکھو!" بوڑھے کو دل ہی دل میں افسوس بلکہ پشیمانی کا بھی احساس ہو رہا تھا لیکن اس نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا، مرد کے لئے اپنی کمزوری کا مظاہرہ کرنا کوئی اچھی بات تھوڑی ہوتی ہے۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا؟ محض اس لئے نا کہ میں نے صداقت کا اظہار کر دیا تھا؟"

"تم نے جو کچھ کہا وہ صداقت نہیں تھی اور یہ صورت اس لئے پیدا ہوئی کہ جب تم بچے تھے تو میں نے تمہیں مارنے میں کوتاہی

I—1846

کی تھی۔ آؤ، یہاں آؤ، تم سے کہہ رہا ہوں" اس نے بیٹے کی کہنی پکڑ لی اور اسے کھینچتا ہوا نالے تک لایا جو قبرستان کی دیوار کے پاس مصنوعی تہہ میں بہہ رہا تھا - "جھک جاؤ!"

اسی لمحے مراد نے سفید لباس پہنے ہوئے ایک عورت کو دیکھا جو کھڑے نشیب کے ٹھیک اوپر بنے ہوئے مکان کے چبوترے پر کھڑی تھی۔ ہاں، یہ وہی تھی جس سے ملنے کے لئے وہ کل آیا تھا لیکن تدفین کی وجہ سے اس سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سفید لباس اچانک نظروں سے اوجھل ہو گیا اور مراد نے گھبراتے ہوئے سوچا کہ اب وہ جلدی جلدی یہاں آ جائے گی...

عشورعلی نے ہاتھوں میں شفاف پانی اٹھا کے بیٹے کے سر سے خون دھونا شروع کر دیا۔ پھر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، پلانٹین کی تازی پتیاں نوچیں اور انہیں زخم پر رکھ دیا۔

"اس پر اپنا ہاتھ رکھے رہو۔ اس طرح سے۔ بالکل معمولی چوٹ ہے۔ مرد بنو۔ صرف عورتیں ہی خون دیکھ کے بےہوش ہو جایا کرتی ہیں... کتے کے زخم کی طرح تمہارا یہ زخم اچھا ہو جائے گا۔ میں خود تجربے سے جانتا ہوں۔"

"اباجان، آپ نے انتقاماً یہ کارروائی کی۔ اور یہ سب بالکل غلط ہے۔ لوگوں کو نئی جگہ پر رہنے دیجئے۔ انہیں روکئے نہیں۔"

عشورعلی نے کچھ نہ کہا۔

"زندگی میں جو کچھ نیا ہو اس کا ساتھ دینا ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔"

"اور جو کچھ قدیم ہو اس سب کو بلا سوچے سمجھے ٹھکرا دیا جائے؟ تو اب میں پرانے اور تم نئے ہو؟ ہی۔ ہی! اور تمام قدیم رسم و رواج کو، تمام قدیم روایات کو گھورے پر پھینک دیا جائے، برباد کر دیا جائے؟ ویسے تو پرانی باتوں میں سے اب بمشکل ہی کچھ باقی رہ گیا ہے، نہ اچھائیاں باقی رہ گئیں، نہ برائیاں۔ قریب قریب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے بدلے میں نئے نظام نے دیا کیا؟ میں تم سے پوچھتا ہوں اس نے روح کے لئے، انسان کے لئے دیا کیا؟"

"روح کے لئے آزادی، اباجان۔"

"فرض کرو کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے..."

"تو ہمیں مسرت ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ نہیں؟ لیکن آپ خود مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ پرانے زمانے میں بیٹے تک کی پیدائش پر ہر شخص نہیں مسرور ہو سکتا تھا۔ سوچا جاتا تھا کہ اب ایک اور فرد کے لئے کھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ کیا یہ سچ نہیں؟ آپ چپ کیوں ہیں؟ اور بیٹی کی پیدائش پر تو لوگوں کو اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی تھی۔"

"لیکن بیٹی کی عزت کی مقدس امانت کی طرح حفاظت کی جاتی تھی! اب جس قسم کی آوارہ لڑکیاں ہمارے یہاں پائی جاتی ہیں ان کے معاملے میں نرمی برتنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ کیا تمہاری آزادی یہی ہے؟ اور تم لوگوں نے مرد عورت کے پھولنے پھلنے کو، شادی کی قدیم تقریب کو کیا بنا کے رکھ دیا ہے؟"

"آپ کا مطلب نئی تقریب سے ہے؟"

"میرا مطلب تمہاری نام نہاد کومسومول شادی سے ہے۔ کہو نا؟ تمہارا چہرہ سرخ ہوا جا رہا ہے؟ تمہیں شرم آ رہی ہے نا؟"

"لیکن میرا شمار مستثنیات میں سے ہو سکتا ہے۔"

"یہ ایک احمقانہ اور گستاخانہ بات ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"دوسری باتوں سے قطع نظر، محض اس وجہ سے ہی کہ بچوں کی شادی سب سے پہلے ان کے بزرگوں، ان کے خاندان اور رشتےداروں کے لئے مسرت اور فخر کا باعث ہوتی ہے۔ دراصل وہی لوگ اپنی کامیابی کا جشن مناتے اور مسرور ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بچوں کو پروان چڑھانے اور ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن نئی شادی سے آخر کیا ملتا ہے؟ خود تم کو کیا ملا تھا؟"

"اس کے متعلق باتیں نہ کیجئے، اباجان۔ میں آپ سے التماس کرتا ہوں۔"

"کیوں نہ کروں؟ تلخ بات بھی تو یاد کرنی چاہئے۔ تمہیں میری شرکت گوارہ نہ تھی تو تم نے کم از کم دنگیر — دنگارچو ہی کو مدعو کر لیا ہوتا۔ ندامت محسوس ہو رہی ہے؟"

ان سب برسوں کے باوجود جو اس واقعے کے بعد بیت چکے تھے،

اس کا باپ نہ بھول سکا تھا، نہ معاف کر سکا تھا۔ بیٹے نے لاابالی پن کا ثبوت دیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور اب باپ کی لعنت ملامت ڈنک کی طرح چبھتی معلوم ہو رہی تھی۔

"تمہارے رشتےدار، تمہارے اقارب، تمہارے بھائی کہاں تھے؟ خاندان کا شریفانہ، مٹایا نہ جا سکنے والا تصور کیا ہو گیا تھا؟ تمہارے پاس کوئی جواب نہیں نا؟ تم اسے تعصب کہتے ہو؟ غلطی پر ہو! لیکن اب ان باتوں میں رہا ہی کیا ہے۔ کہستانی علاقوں میں بھی چچازاد، خالہزاد بھائی بہنوں کی اولادیں ایک دوسرے کو نہیں پہچانتیں۔ جلد ہی لوگ اپنے چچازاد، خالہزاد بھائی بہنوں کو بھی بھول جائیںگے اور وہ وقت دور نہیں جب آدمی اپنے بھائی سے دریافت کرےگا: "تم کس کے بیٹے ہو؟" کیا یہ ہولناک بات نہیں؟ میں یہ نہیں کہتا کہ قدیم قبائلی خاندان کو کسی تبدیلی کے بغیر برقرار رکھا جانا چاہئے۔ آج تو ہر چیز، خون اور قوم سب کچھ گڈمڈ ہو کے رہ گیا ہے لیکن اگر ایسا ہے تو ہمیں ایک نیا خاندان دو، اسے مستحکم بناؤ، اس کی جڑوں کو گہرائی تک جانے دو۔ خاندان کی جڑ اور چوٹی کو مستحکم اور قوت حیات کا مرکز بناؤ۔"

"دراصل اباجان، آپ رشتوں کے قدیم تصور کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں جبکہ ایک نیا تصور جنم لے رہا ہے اور یہ ہے لوگوں کی، معاشرے کی برادری کا تصور۔"

"خاندان یا قبیلے کے بغیر؟ خونی رشتوں کے بغیر؟"

"جی ہاں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، لوگوں کی، سوویت لوگوں کی نئی برادری، دوسرے اور تیسرے درجے کے رشتوں سے بلند و برتر ہے۔ اور ان کی یہ روحانی برادری، مستحکم جڑوں اور زبردست چوٹی کے ساتھ دھرتی پر پھولے پھلےگی۔"

"مجھے اس کا یقین نہیں۔ نہیں، میں اس پر یقین نہیں کرتا۔"

"لیکن اس کا انحصار اس بات پر نہیں کہ کوئی شخص اس پر یقین کرتا ہے کہ نہیں۔"

"میں "کوئی شخص" نہیں ہوں، تمہارا باپ ہوں... خیر ہوگا لیکن سنو: بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے بچوں کی شادی صرف اپنے برابر والے خاندانوں ہی میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو بتاؤ

ان سب باتوں کا آخر اس سے کیا تعلق ہے؟ میرا مطلب ہے جب کسی ریاستی فارم کا ڈائرکٹر اور کسی اجتماعی فارم کا چیرمین اپنے بچوں کی شادی کے ذریعے ایک دوسرے سے رشتہ قائم کرتے ہیں یا کسی گوشت فیکٹری اور کسی ڈیری کے ڈائرکٹر اسی طرح آپس میں رشتےداری قائم کرتے ہیں۔ میں بوڑھا ہوں، بھلا اس معاملے کو کس طرح سمجھوں؟"

"اس کی مثال سمندر میں ایک قطرے کی سی ہے۔"

"لیکن قطرہ سمندر کو سیاہ کر سکتا ہے۔"

"جی نہیں۔ کسی صحت‌مند معاشرے کے لئے یہ کوئی خطرہ نہیں۔"

"یہ تو تمہارا خیال ہے نا۔ میں خود اپنے خیالات پر قائم ہوں۔ تدفین کی رسم ہی کو لے لو۔ یہ آج بھی ویسی ہی ہے جیسی ہزار سال قبل تھی۔ لوگ کاغذ پر لکھی ہوئی تعزیتی تقریروں کو قبول نہ کریں‌گے۔ وہ انہیں چاہتے ہی نہیں۔ ربادان کے بیٹے محمد کی تقریر جیسی کوئی تقریر ہو جاتی ہے تو سال بھر تک لوگوں کی گفتگو اور مذاق اڑانے کا موضوع بنی رہتی ہے اور یاد ہے علی کی تدفین کے موقعے پر اس نے کاھے کے متعلق تقریر کی تھی؟ اس کے کام اور نجی زندگی کے متعلق۔ یہی نہیں، اس کے ٹریڈ یونین واجبات کی ادائیگی کرنے کے تذکرے تک کو وہ نہیں بھولا تھا۔ تو؟ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ قدیم کو اکھاڑ پھینکنے سے پہلے تمہیں سوچنا چاہئے کہ اس کی جگہ کیا دے رہے ہو؟"

اس موقعے پر آب‌رنگ تصویروں کا کوئی مصور موجود ہوتا تو اس نے نالے کے قریب واقع دیوار کے بھورے سبز پس‌منظر میں اپنے موقلم کی رواں جنبشوں سے عشورعلی کی تصویر کچھ یوں کھینچی ہوتی: پیشانی، ناک، رخساروں کی ہڈیوں اور کان کی لوؤں کو تیز زرد رنگ سے اجاگر کرتا اور ان میں آفتاب کی فیاضی شامل کر دیتا۔ اس کی مونچھوں اور گول داڑھی کے لئے زردی مائل بھورا اور سنہرا رنگ استعمال کرتا۔ کھلے گلے کے کہستانی کوٹ "بیش‌میت" کے لئے گہرا نیلا رنگ استعمال کرتے ہوئے بٹنوں کو ذرا کچھ ابھار دیتا لیکن پاپاخا کی عکاسی اس کے اپنے رنگ میں کرتا — روئیں‌دار اور قطعاً سیاہ۔ آنکھوں کو اس نے بھنوؤں کے نیچے

نصف چھپی ہوئی، کچھ سوچتی ہوئی سی دکھایا ہوتا۔ اور اس سب کے نتیجے کے طور پر ایک جدید تصویر وجود میں آ جاتی۔

"کیا یہ آپ ہی نہیں تھے جس نے دنگیر — دنگارچو کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یہیں دفن کئے جانے کی خواہش ظاہر کریں؟" مراد نے اپنی بات جاری رکھی۔

"میں نے کچھ نہیں کہا تھا! کچھ بھی نہیں! ہاں، اپنے مرنے کے وقت ضرور کہوں‌گا۔ میں لوگوں سے کہوں‌گا کہ وہ مجھے بھی یہیں، میرے آبا و اجداد کے پہلو میں دفن کریں" بوڑھے نے ڈنڈا بلند کرتے ہوئے قدیم قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہیں، جہاں میرے والد، میرے دادا اور میرے پردادا دفن ہیں۔ یہ تو تم لوگ ہو، تم ناشکرگزار اولاد، جن کی کوئی آخری خواہش نہیں ہو سکتی۔ لوگ تمہیں کہیں بھی، کسی بھی طرح دفن کریں تم لوگوں کو کوئی پروا نہیں..."

"کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ اکیلے نہیں ہیں، آپ پر بہت ذمےداریاں عاید ہیں کیونکہ آپ کی باتوں کو لوگ بہت اہمیت دیتے ہیں؟"

"مجھے یہ جان کر فخر ہوتا ہے کہ لوگ میری باتوں کو اہمیت دیتے ہیں!"

"لیکن آخر لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

"میں نے ایمانداری سے زندگی بسر کی ہے، کبھی کسی سے روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہیں چھینا اور یہی وجہ ہے کہ لوگ میری عزت کرتے ہیں۔"

"نہیں اباجان، آپ غلطی پر ہیں، وہ آپ کی عزت نہیں کرتے۔ دراصل وہ آپ کی مخالفت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"

"تم نے بھلا ایسی گستاخی کہاں سے سیکھی؟" بوڑھے کے چہرے پر مرجھائی ہوئی گھاس جیسا رنگ آ گیا۔

"آپ کے ڈنڈے کی مار سے!"

بوڑھا یکبارگی ٹھہر گیا۔ اس نے غصے پر قابو پاتے ہوئے ابکے کچھ دھیرے سے، مصالحتی انداز میں کہا: "پھر خون بہنے لگا۔ اسے دھو ڈالو!"

لیکن دوسرے ہی لمحے اسے کچھ اور شدت سے غصہ آ گیا۔

اس نے کانپتے ہوئے ایک قدم اٹھایا لیکن مڑ کے چلنے لگا تاکہ اب بیٹے کے ساتھ اکیلا نہ رہ جائے اور اس پر پھر نہ ہاتھ چلا دے۔

بیٹے نے مڑ کے جائزہ لینے والی نگاہوں سے باپ کو پیچھے سے دیکھا اور پہلی بار اس کی توجہ باپ کی جھکی ہوئی کمر، گول ہو جانے والے شانوں اور گھڑسواری کے باعث ٹیڑھی ہو جانے والی ٹانگوں میں پیوند لگے، بغیر پالش کئے ہوئے لانگ بوٹوں پر مبذول ہو گئی۔ اسے اپنے باپ پر ترس آ گیا لیکن ابھی اس کے دل میں اس جذبے کو تقویت بھی نہ حاصل ہو پائی تھی کہ بوڑھے نے اپنی عجلت میں ٹھوکر کھائی اور جسم کا توازن بگڑ جانے کے باعث زمین پر آ رہا۔ مراد فوراً ہی مدد کے لئے اس کے پاس پہنچ گیا اور اسی لمحے انہوں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی: "ارے عشورعلی، آپ نے عبادت کے لئے غلط جگہ منتخب کی ہے!" بوڑھے نے لنگڑے عثمان کے اس احمقانہ مذاق کو نظرانداز کر دیا اور اس شخص کی طرف مڑا جو اسے سہارا دے رہا تھا، اٹھ کھڑے ہونے میں بہت احتیاط کے ساتھ مدد دے رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کی کمزور اور بےجان سی آنکھوں کو دیکھا جن سے تھکن اور افسردگی جھلک رہی تھی۔ بوڑھے کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں شبنم کے قطروں کی طرح دو آنسو چمکنے لگے اور اس نے اپنا منہ موڑ لیا۔

"تم گھر جا رہے ہو؟" عشورعلی نے مڑ کے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا اور جواب میں سنا:

"نہیں، اباجان!"

چنانچہ وہ دونوں الگ الگ راستوں پر چل نکلے۔ مراد ایک کھڑے نشیب پر واقع چٹان کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک بار ناخوشگوار حادثہ ہو گیا تھا جو اب تک یاد کیا جاتا ہے: ایک لاپروا ڈرائیور نے ڈھلواں پتھریلی سڑک پر بس چھوڑ دی تھی، بریک اسے روکے رہنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ بس تیزی سے دوڑتی ہوئی نیچے چلی گئی تھی جس سے کسی سنیما گروپ کے دو افراد ہلاک ہو گئے تھے...

مراد اپنے خیالوں میں کچھ اتنا زیادہ کھویا ہوا تھا کہ ایک برہنہ‌پا چھوٹی لڑکی کو جو اونچی سی فراک پہنے اور چھوٹے بالوں کی دو بکری کی سینگ جیسی چوٹیاں سر کے پیچھے نکالے ہوئے

تھی، اپنے عقب میں دوڑتے اور پکارتے ہوئے نہ سن سکا۔ اس نے اس کی طرف صرف اس وقت توجہ مبذول کی جب وہ اس کے بالکل برابر آ گئی۔ اس نے چار تہہ کیا ہوا ایک پرچہ اسے تھمایا اور دوڑتی ہوئی واپس جانے لگی لیکن اچانک ٹھہر کے پھر مڑتے ہوئے اسے دیکھا اور دانتوں تلے انگلی دبا کے شرارت سے مسکرا دی۔ مراد نے پرچے کو کھول کے پڑھا۔ صرف چار الفاظ تھے: "میں وہیں ہوں‌گی۔" اس کے سوا اور کچھ بھی، دستخط تک بھی نہیں تھے لیکن مراد سمجھ گیا۔ وہ اسی جگہ کو جا رہا تھا جہاں وہ منتظر تھی۔ پرچے سے لکھنے والی کی صرف بےچینی اور شکوک کا پتہ چلتا تھا... مراد نے ملاقات کے بارے میں سوچتے ہوئے رفتار تیز کر دی حالانکہ باپ سے ہونے والی بات‌چیت جس سے اسے خاصی پریشانی ہوئی تھی، اب بھی اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

سخلی پہاڑ کی جنگلاتی ڈھلان کے سناٹے میں کوئی تنہا اور اداس کوئل اکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ زندگی کے ان برسوں کو جن کا لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا، شمار کئے جا رہی تھی۔

نئی جھیل کے کنارے

خیالوں میں کھوئی کھوئی سی، تنہا کھڑی ہوئی کہستانی عورت ایک ایسا پیکر رعنائی ہے جس پر نگاہ پڑتے ہی آدمی پر ایسے لطیف احساسات طاری ہو جاتے ہیں جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس عالم میں کسی عورت کا دکھائی دینا کہستانی علاقوں میں آج بھی ایک غیرمعمولی بات ہے جس کی سخت اور قدیم قوانین کے علمبردار یقیناً ناپسندیدگی کے ساتھ مذمت کریں‌گے گویا کہ کسی عورت کو سوچنے، محسوس کرنے یا اپنے گرد و پیش کے مناظر سے بس یونہی لطف‌اندوز ہونے کا کوئی حق ہی نہ ہو۔

وہ اپنے سفید لباس میں، چٹان کے اوپر تنہا، غروب ہوتے ہوئے آفتاب کے لئے ایک للکار کی طرح کھڑی شعاعوں سے چمکتی ہوئی جھیل کی ہلکی ہلکی لہروں کو تکے جا رہی ہے جو اس کے سفید لباس میں سنہری چمک پیدا کر رہی ہے۔ کچھ وقت پہلے تک جھیل

کا کہیں وجود ہی نہ تھا۔ یہ تو اس وقت وجود میں آئی جب باندھ نے سفید دریا آق‌سو کے بلندیوں سے آتے ہوئے پانیوں کو اسیر کر لیا۔ یہ وہی دریا ہے جو چابک کھائے ہوئے گھوڑے کی طرح تیزی سے دوڑتا، جھاگ اڑاتا اور قدیم چرکیئی کے قریب واقع گہری گھاٹی سے عجلت کے ساتھ بھاگ نکلنے کا کوشاں رہتا ہے۔ ہموار سطح والی یہ جھیل بڑی پرسکون ہے اور اس کی خاموشی کا طلسم صرف ننھی ننھی لہروں سے پیدا ہونے والے ہلکورے ہی توڑ رہے ہیں... اور یہاں گاؤں سے، لوگوں کی نظروں سے دور دراز جگہ پر نہ جانے کہاں سے یہ عورت نمودار ہوئی ہے۔ اسے آخر کون سی چیز یہاں کھینچ لائی ہے؟ وہ کن خیالوں اور فکروں سے تڑپ رہی ہے؟ وہ کسی مجسمہ‌ساز کے شاہکار کی طرح کھڑی طلائی دندانوں میں جڑے ہوئے کسی فیروزے کی جیسی، محبت کا آنسو کہلانے والے مشرق کے اس پسندیدہ پتھر کی جیسی غیرمعمولی جھیل کے کنارے کی زینت بڑھا رہی ہے۔ یا شاید محض اس کی تنہائی اور اس کے گرد و پیش کے مناظر نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے؟ کہستانی مرد، عورت کے حسن کے متعلق خود اپنی ایک رائے رکھتے ہیں: "بھئی، تمہیں چاہئے کیا؟" وہ کہیں گے: "وہ نہ کانی ہے نہ اندھی، کبڑی ہے نہ لنگڑی۔ اس کے رخساروں سے صحت‌مند خون جھلکتا ہے، بہری گونگی بھی نہیں حالانکہ خاموشی عورت کا زیور ہوتی ہے... اب اور تمہیں چاہئے کیا؟ ان باتوں میں اچھے اوصاف کا بھی اضافہ کر دو: شفقت، خوش‌دلی، فرماں‌برداری، اور سوجھ بوجھ!"

آفتاب کی محبت بھری شعاعیں اس کے بدن کو سہلا رہی تھیں۔

ہاں یہ وہی تھی، کڑیل سرزمین کی نیک‌دل بیٹی۔

یہ سلطنت تھی۔

یہ وہی تھی جس نے پرچہ بھیجا تھا۔

کوئی شخص حیرت سے سوچ سکتا ہے کہ اسے، گاؤں سوویت کی چیرمین کو ایسی پرکشش نسائیت کی کاہے کے لئے ضرورت آ پڑی تھی؟ لیکن کیا یہ بہتر ہوتا کہ گاؤں سوویت کی چیرمین کانی یا لنگڑی ہوتی؟ لوگوں نے اسے منتخب کیا تھا تو یقیناً انہیں اس میں کوئی ایسی چیز نظر آئی ہوگی جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی

تھی۔ محض اس کے حسن کو سراہنے کے لئے تھوڑی منتخب کیا ہوگا حالانکہ اس کے چہرے سے آنکھیں ہٹا لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ آنکھیں اس پر نثار ہوتی تھیں تو ہوا کریں۔ دراصل آنکھیں ہوتی ہی اسی لئے ہیں کہ وہ رخسار کے تل اور مسور کے دانے میں، کسی لڑکی کی ہنس جیسی گردن اور گھوڑے کے شانے کی ہڈیوں کے درمیانی ابھار میں، شبنم‌آلود سرخ پوست اور پوست کی گرتی ہوئی پنکھڑیوں کی طرح بوسے نچھاور کرنے کو تیار نوجوان ہونٹوں میں امتیاز کر سکیں... ہم لوگ یہ کاہے کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟ سن شعور کو پہنچے ہوئے لوگ اور ایسی باتیں؟ پاپاخائیں پہننے والوں کے لئے ان چیزوں کے بارے میں باتیں کرنا مناسب نہیں جن سے متعلق باتیں ناشائستہ تصور کی جاتی ہیں اور جن کے سلسلے میں خاموشی اختیار کرنی چاہئے۔

وہ آفتاب کی طرف جا رہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ آفتاب کا کوہساروں کے عقب میں غروب ہونے کو جی نہ چاہتا ہو اور وہ اسے خود اپنی چمکیلی نگاہ کے سامنے اور دیر تک رکھنے کے لئے نہ ڈوبے۔

جھیل کی ہموار نیلاہٹ کے اوپر ایک سفید طائر!

کراماتی جھیل – ہاں، میں کوہساروں میں انسان کے ہاتھوں رونما ہونے والے اس نیلے معجزے کو یہی کہوں‌گا۔ شاعرو، تم کہاں ہو؟ کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہو؟ اس جادو کرنے والی تمام نغمگی کو کان لگا کے سنو: اپنے محبوب سے ملاقات کے لئے آنے والی کہستانی عورت کے روپ میں سفید طائر کے چاروں طرف بکھرے ہوئے رنگوں سے دامن نگاہ بھر لو۔

وہ چونک پڑی – اب یقیناً کچھ بلند ہو کے، چمکتی ہوئی اس جھیل کے اوپر فضا میں تیرنے لگےگی۔ لیکن نہیں، وہ فضا میں تو نہیں تیری۔ وہ تو اس شخص سے ملنے کے لئے دوڑ پڑی جو تیزی سے قدم اٹھاتا اس کی طرف آ رہا تھا اور جا کے اس کی بانہوں میں سما گئی، مسرت کی چیخ کے ساتھ نہیں، بلکہ سسکیاں بھرتی ہوئی۔ مراد نے اسے کلیجے سے لگا لیا لیکن اس کے رونے کا سبب نہ سمجھ سکا۔

"ارے بھئی، یہ تم کس کا سوگ منا رہی ہو؟ دنگیر – دنگارچو

کا یا میرا؟ لیکن میں تو زندہ ہوں۔" وہ اس کے ملائم بالوں پر اس مبہم سے احساس کے ساتھ ہاتھ پھیرنے لگا کہ ماں باپ کو شمار نہ کیا جائے تو اس کے لئے اس سے زیادہ قریب اور عزیزترین اور کوئی بھی نہیں۔ "بات کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں..."

"تو آخر رو کیوں رہی ہو؟"

"میں ڈر رہی تھی کہ آپ نہ آئیں گے۔ میں نے تو اپنے آپ سے کہا بھی تھا: بہتر ہے کہ وہ نہ آئیں۔"

"میں واپس جا سکتا ہوں" مراد نے کہا۔ اس لئے نہیں کہ وہ سچ مچ ایسا کرنا چاہتا تھا بلکہ محض اس غیرشعوری خواہش کے تحت کہ اسے ملائمت سے کہتے سنے: "نہیں، جائیے نہیں۔"

سلطنت اس کے سینے سے کچھ اور زیادہ چمٹ گئی۔

"آخر تم رو کیوں رہی ہو؟" اس نے اسے کانپتے ہوئے محسوس کر کے پوچھا۔

"میں پہلے ہی بتا چکی ہوں... رو اس لئے رہی ہوں کہ آپ آ گئے" اس نے سر اٹھائے بغیر دبی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"اور اگر نہ آیا ہوتا تو؟.." کہستانی مرد بھی کبھی کبھی کتنے بےرحم ہو جاتے ہیں! کیا یہ سچ نہ تھا کہ اسے خود پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا؟ آخر کسی عورت کے دل کو اس طرح آزمانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سلطنت بڑی سرکش ہے اور کسی فوری جذبے کے تحت کچھ بھی کہہ یا کر سکتی ہے۔

"تو آپ مجھے روتے ہوئے نہ سن سکتے (بہت اچھا جواب دیا کہستانی عورت نے، آخر تمہیں اپنے خیالات اور جذبات کو پوشیدہ رکھنے کی کیا ضرورت!) کیونکہ مجھے نہیں معلوم، روئی ہوتی کہ نہ روئی ہوتی۔"

"خیر، مجھے معاف کر دو... میں نے دور سے تمہیں دیکھا تو کیا بتاؤں کہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ بالکل کسی سفید طائر جیسی" اس نے اس کے بالوں کی مہک سونگھی اور مرد کہستانی کچھ یوں نرم پڑ گیا جیسے گرم پانی میں برف پگھل جاتی ہے۔ اس ملاقات کی مسرت کے اشتیاق ہی میں تو وہ جلدی جلدی یہاں آیا تھا۔

"ذرا ایک منٹ ٹھہرئیے۔ آپ چاہتے ہیں کہ معاف کر دوں؟ میں

تو آپ کو معاف کرنے سے رہی۔ بالکل نڈھال ہو چکی ہوں، جانے کتنی اذیت برداشت کی ہے کل آپ کا انتظار کرتے کرتے۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کو دیکھے بغیر پورا ایک مہینہ گزار دینے میں مجھ پر کیا بیتی۔ اس کے بعد آپ آتے ہیں، بالکل قریب ہی ہیں، اس کے باوجود میں صبح تک آپ کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔ واقعی آپ پتھر ہیں پتھر۔ آپ..."

" ارے بھئی، سمجھتیں کیوں نہیں، میں آ ہی نہیں سکتا تھا" اس نے سلطنت کو خود سے کچھ الگ کر دیا یا شاید وہ خود ہی اپنے جذبات کے بےباکانہ اظہار پر شرما کر کچھ پیچھے ہٹ گئی۔

"لیکن آپ چاہتے تو اس سے پہلے آ سکتے تھے، آپ آ سکتے تھے..."

اس محبت بھری ناراضگی سے اسے خوشی تو ہوئی لیکن اس کے سینے میں محتاط رہنے کا احساس بھی بیدار ہو گیا۔

"میں بھی نری احمق ہوں..." سلطنت ہنس پڑی لیکن یہ ہنسی مسرت کی نہیں خوف اور پشیمانی کی تھی۔

"مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ اپنے متعلق خوف محسوس ہو رہا ہے" اس نے گلوگیر آواز سے کہا۔ "آپ مجھے تباہی کے کگارے پر لئے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں گر پڑوں۔"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ یہ سلسلہ اب ختم بھی کریں!" مراد نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "میں بھی ان خطرناک راستوں سے تنگ آ چکا ہوں، واقعی تنگ آ چکا ہوں۔ اس سب کو، گاؤں اور گاؤں سوویت کو خیرباد کہہ کے میرے پاس چلی آؤ - میری بیوی اور میرے گھر کی مالکن کی حیثیت سے۔ تب جو بھی مرضی ہو مجھ سے کہو، میں پوری کروں گا۔ تم نے تو خود ہی وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں، وعدہ تو کیا تھا لیکن صرف اسی وقت جب میں ہر ایک کو نئے چرکیئی میں منتقل کرا کے نئی زندگی کی کنجیاں ان کے ہاتھوں میں دے دوں..."

"لیکن وہ لوگ کبھی بھی منتقل نہ ہوں گے۔ وہ ضدی..."

"جی ہاں اور آپ کے والد سب سے زیادہ ضدی ہیں۔ ان لوگوں کو قائل کرنے میں میری مدد کیجئیے نا۔"

"تم تو ایک ایسی بات کے متعلق کہہ رہی ہو جو ناممکن ہے۔" پھر اس نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے پوچھا: "تمہارا شوہر اب کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"یہاں، میرے پہلو میں۔"

"نہیں، میں سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں، وہ کہاں ہے؟"

"جیسے آپ کو معلوم ہی نہ ہو!"

"مجھے لوگوں نے بتایا ہے کہ وہ واپس آ گیا ہے..."

"میرے کوئی دوسرا شوہر نہیں، اور کوئی بھی نہیں!" اس نے مراد کے شانے پکڑ کے اسے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ یہ ایک دوسری سلطنت تھی۔ اس سے تو یہ بھی ممکن تھا کہ اسے بلا کسی تامل کے پانی میں ڈھکیل دیتی، اسی سرد، گہری جھیل میں۔ مراد تو ایک قدم پیچھے بھی ہٹ گیا۔

سلطنت دل ہی میں مسکرائی: "اچھی بات ہے غصہ کر لیجئے، غضبناکی دکھا لیجئے، آپ کو مجھ پر کچھ اور پیار آئے گا۔"

دوسرا باب

جس میں بتایا گیا ہے کہ چیکا — سیزل — میٹر کوہساروں کے دائمی امن میں کس طرح خلل پڑا اور کس طرح "عقاب نشیمن" میں نئی فکروں اور اندیشوں نے لوگوں کو گھیر لیا۔

معمر اور وامانده آفتاب تلے

سلاتاؤ سلسلہ کوہ کو دیکھ کر کوئی شخص واقعی یقین کر سکتا ہے کہ اگر پرومیتھوس* کو دیوتاؤں سے آگ چرا کے انسان کو دینے کے سلسلے میں، سچ مچ قفقاز کی کسی ڈھلواں چٹان میں زنجیروں سے

* یونانی دیومالا کے بموجب ایک دیوتا۔ اڈیٹر۔

باندھ دیا گیا تھا، تو وہ جگہ کہیں انہی مہیب، ناقابل رسائی چٹانوں پر رہی ہوگی! صرف دیوتا ہی ایسے نیک کام کے لئے اتنی سخت سزا دینے کا تصور کر سکتے تھے۔

سلاتاؤ وہاں ہے جہاں عمیق‌ترین اور نہایت ہی متاثر کرنے والی گھاٹی سولاک واقع ہے۔ اس کی اتنی زیادہ مہیب گہرائیاں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، دکھائی دیتی ہیں تو انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ لیکن نیچے سے دیکھا جائے تو آگے کو نکلی ہوئی ڈھلواں چٹانوں کے درمیان ایک تنگ شگاف سا، سر چکرا دینے والی بلندیوں تک ابھرتا نظر آتا ہے۔ ان سے کچھ اور اوپر بادلوں کے درمیان خالی جگہوں سے سلسلہ کوہ کی برف پوش چوٹیاں چمکتی دکھائی دیتی ہیں، یہاں ان کے پہلو بہ پہلو جھاگ سے سفید سولاک دریا چیختا چنگھاڑتا ہے۔ وہ بھاری چٹانوں کے درمیان جو اس کے بہنے کے راستے کو تنگ کر دیتی ہیں بل کھاتا ہوا، عمودی چڑھائیوں سے بڑی غضبناکی کے ساتھ سر ٹکراتا اور پانی کی رنگ برنگی زبردست پھواریں بکھیرتا ہے۔ گھاٹی کے پہلوؤں پر جہاں تہاں مٹی کے کچھ چھوٹے قطعات ہیں لیکن ان پر تقریباً کچھ بھی نہیں اگتا، صرف اکا دکا جھاڑیاں یا ایک آدھ فر یا برچ کا پیڑ نظر آ جاتا ہے جیسے پتھروں کے شگافوں میں جڑ پکڑنے کا موقع مل گیا ہے۔

گھاٹی کے زیادہ کشادہ علاقوں میں سے بہت بڑے پیالے کی شکل کے ایک علاقے میں جو چونے کے پتھر والے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور "عقاب نشیمن" کہلاتا ہے، بہادر اور جفاکش لوگوں کا گاؤں چرکیئی واقع ہے جو اتنا ہی قدیم ہے جتنے وہ پتھر جن سے عمودی ڈھلانوں پر قائم ہموار چھت والے مکانات تعمیر کئے گئے ہیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ گاؤں اس جگہ پانچ سو برسوں سے قائم ہے لیکن بعض دریافتوں سے پتہ چلا کہ "عقاب نشیمن" میں مکانوں کے ابتدائی پتھر کمہاروں کی ظروف‌سازی کی مٹی سے بنے تھے اور کہیں زیادہ قدیم تھے۔

ہم ماضی بعید کی چھان بین نہ کریں گے، خاص طور سے اس لئے اور بھی کہ بعد کے برسوں میں گاؤں سے متعلق زیادہ صحیح اعداد شمار اور نام موجود ہیں۔

پانچ سو برسوں سے یہ گاؤں پتھروں کے لبادے میں لپٹا ہوا عمیق

یہ جپسیوں کا ایسا کوئی قبیلہ تھا، جیسا گلےبانوں کو اس وقت دکھائی دیتا تھا جب وہ اپنے مویشیوں کو قزلیار قصبے کے قریب واقع نوغائی استیپی لے جاتے تھے، تو آخر ان لوگوں کے بچے، گھوڑے اور قافلے کہاں تھے؟

"بھئی، یہ جپسی ہیں تو آخر گاؤں کے اندر آ کے قسمت کا حال کیوں نہیں بتاتے؟" لوگ پوچھتے۔

"ارے، یہ کوئی نیک شگون نہیں، میری بات یاد رکھنا۔"

ان کے کام بھی کچھ عجیب ہی سے تھے، وہ ہر چیز کا جائزہ لیتے، مطالعہ و مشاہدہ کرتے اور ساری باتیں لکھ لیتے۔ انہوں نے دریا کی گہرائی اور چوٹیوں کی اونچائی بھی ناپی... آخر یہ لوگ کون ہو سکتے تھے؟ کیا یہ ممکن تھا کہ انہیں یہاں سونا مل گیا ہو؟ ایسا ہوتا تو بس مزہ ہی آ جاتا، ہے نا؟ پانچ سو برسوں سے لوگ یہاں زندگی بسر کر رہے تھے اور کبھی سوچا تک نہ تھا کہ ان کے قدموں کے نیچے سونا چھپا ہوگا! جانچ پر نکلتے وقت یہ لوگ اپنے ساتھ لمبی لمبی بلیاں لے کے چلتے تھے جن پر سیاہ، سفید اور سرخ نشانات بنے ہوئے تھے۔ وہ اونچی تپائیوں پر دوربینیں رکھ کے بھی دیکھتے تھے... تو آخر پھر وہ کون تھے؟ ماہرین ارضیات؟ ماہرین آثار قدیمہ؟ ماہرین پیمائش ارض؟ کوئی بھی رہے ہوں، اس طرح کے پیشے سلاتاؤ کے لئے بہرحال بالکل نئی چیز کی حیثیت رکھتے تھے جہاں زیادہ‌تر لوگ مویشی پالنے والے یا باغبان تھے۔ سلاتاؤ کے لوگ تو بس یہ جانتے تھے کہ مختلف اقسام کی بھیڑوں کا گوشت کس قسم کا ہوتا ہے، انہیں ذبح کرنے کے لئے کون سا وقت موزوں ہوتا ہے، بھیڑوں کے دودھ سے "برتا" پنیر کیسے تیار کی جاتی ہے اور کس کے شفتالو بہترین ذائقے والے ہوتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے کام!...

تو پھر یہ معموں جیسے خوش‌اخلاق افراد کاھے کے لئے آئے تھے؟ وہ چاہتے کیا تھے؟

چرکیئی کے لوگ ان اجنبیوں کو بد اعتمادی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی آمد شگون بد کی حیثیت رکھتی ہے اور اپنے بچوں کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتے تھے لیکن اس اثنا میں ایک واقعہ، نہایت ہی ناخوشگوار بلکہ شرمناک واقعہ پیش آ گیا۔ یہ

"عجیب و غریب متجسس افراد" اپنے پراسرار کاموں کے سلسلے میں دور پہاڑیوں کو گئے ہوئے تھے تو ان کے خیموں میں چوری ہو گئی۔ سامان کا صفایا کر دیا گیا... اب سوال یہ اٹھا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی؟ اجنبیوں کی؟ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ اجنبی لوگ شاذ و نادر ہی گاؤں آتے تھے۔ نہیں یہ ان میں ہی سے کسی کی، چرکیئی ہی کے کسی باشندے کی حرکت ہو سکتی تھی۔

کیمپ کے افراد نے آ کے اس واقعے کی شکایت کی تو گاؤں سوویت کی چیرمین، خوبصورت سلطنت شرم سے زرد اور سرخ ہو گئی۔ وہ افراد سخت، گول گول چھاتیوں، لمبی موٹی موٹی چوٹیوں اور فیروزے کے ننھے ننھے نگوں سے آراستہ کان کی طلائی بالیوں والی اس خوبصورت عورت کی ندامت سے بھری ہوئی گھبراہٹ اور الجھن کو واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔ اس کی جلد مخمل جیسی نرم اور چکنی اور تازے دودھ جیسی خوشبو والی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ ایک انجینیر کی بیوی ہے جس نے ابھی ابھی سول انجینیرنگ انسٹی‌ٹیوٹ سے ڈگری حاصل کی ہے۔ انہیں خیال آیا کہ بعض افراد واقعی بہت خوش‌قسمت ہوتے ہیں! اتنے نئے آفتاب ایک ساتھ اپنا لیتے ہیں!

وہ لوگ شکایت لے کے آئے تھے لیکن سلطنت کو دیکھ کے اپنی شکایت کو تقریباً فراموش کر بیٹھے اور شرم سے نظریں نیچی کر لیں۔ اس نے خوش‌اخلاقی اور گرمجوشی کے ساتھ اس معاملے کی چھان‌بین کا وعدہ کرتے ہوئے یقین ظاہر کیا کہ ساری چیزیں برآمد کر لی جائیں گی۔ جاتے وقت یہ حالت ہو گئی کہ وہ لوگ خود ہی تقریباً نادم اور گھبرائے ہوئے سے نظر آنے لگے۔

خود سلطنت اس واقعے سے سخت پریشان ہو گئی۔ اس نے مقامی ریڈیو کو استعمال کر کے سارے گاؤں اور خاص طور سے بڑے بوڑھوں سے اس معاملے میں اپیل کرنے کا فیصلہ کیا: ان کی آن بان کے جذبے سے اپیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے الفاظ میں جذبات کچھ اس طرح کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے کہ مکانوں کی پتھر کی دیواریں تک شرم سے کانپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کے ساتھ اس نے لوگوں کے لئے ایک گنجائش بھی رکھ دی اور کہا کہ یقیناً یہ کوئی جانا

بوجھا شرارت آمیز اقدام نہ تھا کیونکہ کسی بالغ مرد یا عورت کے چوری کرنے کا بہت ہی کم امکان تھا۔ اس نے کہا کہ بہت ممکن ہے یہ محض بچوں کی شرارت ہو۔ ورنہ ہمارے اس دور میں کسی باشعور شخص کے چوری کرنے کا کیا سوال! اس کی باتوں کو صحیح پس‌منظر میں سمجھا گیا اور اس شام کو اجنبی لوگ اپنے خیموں کو واپس لوٹے تو انہیں غائب ہونی والی تمام اشیا اپنی جگہوں پر رکھی ملیں۔ صرف والی‌بال کھیلنے کا ایک گیند غائب تھا جو اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ "چوری" دراصل شرارتی بچوں کا کام تھا...

کہا جاتا ہے کہ پائیدار دوستی کے وجود میں آنے کے لئے کسی جھگڑے سے زیادہ اور کوئی چیز معاون نہیں ثابت ہوتی۔ اور ان "عجیب" اجنبیوں اور چرکیئی کے لوگوں کے درمیان پیش آنے والا یہ ناخوشگوار واقعہ سچ مچ رواداری اور اچھے تعلقات کا آغاز بن گیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، خیموں میں رہنے والوں کو پتہ چلتا گیا کہ ان کے قریب ہی میں ان کے دوست اور معاون موجود ہیں۔ فریقین میں بغیر کہے سنے ایک طرح کا تجارتی معاہدہ سا ہو گیا: ہر صبح کو چرکیئی کے لوگ تازہ دودھ، انڈے، مرغیاں، تازہ گوشت، بھورے کلچے، پنیر اور پھل لاتے۔ "کیمپ والے" اس سب کا نقد دام ادا کرتے۔ اس طرح دوستی، باہمی مفادات اور رواداری کی بنیاد پر ان لوگوں کے درمیان اچھے پڑوسیوں جیسے تعلقات قائم ہو گئے۔ طوفانی سولاک دریا پر بنا پتھر کا پل سرحد کا کام دیتا اور فریقین کو متحد کرتا تھا۔ یہ سلسلہ خوش اسلوبی سے جاری رہا کیونکہ اس سے فریقین کو آسانی بھی ہوتی تھی، فائدہ بھی۔ اور اس سے دوستی کے استحکام میں مدد ملی۔ پھر لوگ ایک دوسرے سے ملنے کے لئے آنے جانے لگے، ان مواقع پر الاؤ کے گرد بیٹھ کر باتیں کی جاتیں اور باری باری "پندورہ" اور گتار کی موسیقی پر گیت گائے جاتے۔ اس سب کو وہ لوگ ثقافتی تبادلہ کہتے تھے۔ کسی جشن کا دن آتا تو چرکیئی کے دریادل لوگ کھانے اور کباب کے لئے کوئی عمدہ سی موٹی تازی بھیڑ لاتے اور کیمپ والے بیرونی شرابیں۔ اور وہ اس کو ضرورت کا اتحاد کہتے۔

تو اس طرح اب ہر چیز بالکل ٹھیک معلوم ہو رہی تھی اور خیموں میں رہنے والے افراد کا گاؤں کے مختلف گھروں میں اکثر مہمانوں کی حیثیت سے خیرمقدم کیا جانے لگا تھا۔ اس باہمی میل جول کے بعد محبت ہی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ جیسا کہ لوگوں کی نگاہ میں قابل احترام مختدر نے جو جھگڑالو اور رنڈوا تھا، دانشورانہ انداز میں تبصرہ کیا، دوستی محبت کو جنم دیتی ہے۔ اس طرح کی بات عموماً وہ لوگ کہتے ہیں جنہیں نہیں معلوم ہوتا کہ خود ان کی پتیلیوں میں کیا چیز ابل رہی ہے۔ مختدر ہر ایک کے جنازے میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی کے سفید گھنے بال نکلے رہتے تھے کیونکہ وہ کبھی داڑھی نہیں بناتا تھا صرف قینچی سے بڑے بالوں کو کاٹ دیا کرتا تھا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں: "یہ تو بڑی بےتکی بات ہے نا؟" یہی سوال خود مختدر سے کیجئے تو وہ جواب دےگا: "آفتاب زندہ‌باد!" آپ پوچھیں‌گے: "آفتاب کیوں؟" اور وہ جواب دےگا: "تمہارا یہ سوال کیوں؟" آپ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہئے... ہاں تو ہم لوگ کاہے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے؟ ہاں یاد آیا، محبت کے بارے میں۔ تو کچھ ایسا ہوا کہ اجتماعی فارم کا ٹرک ڈرائیور قیت‌مس جس کا مطلب ہے "جو واپس نہیں لوٹتا" اور جو اسی مختدر کا بیٹا تھا، خیموں میں رہنے والی لڑکیوں میں سے ایک پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ جی ہاں، ایک ایسی لڑکی پر جو لباس نہیں پہنتی تھی۔ میری بات کا غلط مفہوم نہ نکالئے۔ میرا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ برہنہ پھرا کرتی تھی۔ جی نہیں، وہ پتلون پہنتی تھی۔

ہاں، تو یہ لڑکی جس کے پیچھے قیت‌مس دیوانہ ہو گیا، بڑی خوبصورت تھی جیسے دھوپ میں رکھی ہوئی گیہوں کے پودوں کی پولی۔ اس کا نام بھی دھوپ ہی جیسا تھا — سویتا*۔ اس کی آنکھیں گہرے رنگ کے فیروزے جیسی تھیں، سلاتاؤ پہاڑ کے اوپر آسمان جیسی۔ وہ روسی تھی ہنسنے بولنے والی چنچل لڑکی۔ اوہ، یہ روسی لڑکیاں بھی کتنی چنچل اور شرارتی ہوتی ہیں! وہ کسی کو بھی اپنے

* سویت کا روسی زبان میں مطلب ہے روشنی۔ اڈیٹر۔

جادو سے، خود اپنے آزادی کے لبھانے والے احساس سے اور خود اپنی ذات پر مکمل اعتماد سے گرویدہ بنا سکتی ہیں۔ بھلا کوئی کہستانی آزادی کے ایسے احساس کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے؟ "آزادی زندہ‌باد!" ہی کا نعرہ لگاتے ہوئے تو کہستانیوں نے اراکان پہاڑوں میں جانیں دی تھیں اور آئیا گھاٹی میں انقلاب دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا۔

بےشک یہ ایک حقیقت ہے کہ پتلون پہننے والی لڑکی کہستانی لوگوں کو کچھ عجیب سی، دراصل مضحکہ‌خیز سی معلوم ہوتی تھی۔ یوں تو وہاں کی عورتیں بھی شلوار پہنتی تھیں لیکن وہ شلوار کے اوپر ڈھیلی جمپر بھی پہنا کرتی تھیں۔ چنانچہ قیت‌مس پر جو پتلون والی اس لڑکی کے ساتھ بہت زیادہ وقت گزارنے لگا تھا، خوب خوب فقرے چست کئے گئے، شادی کی رات کے لئے خوب خوب مشورے دئے گئے۔ وہ سب کچھ سنتا لیکن ایک کان سے سن کے دوسرے سے نکال دیتا اور ہنسنے لگتا۔ اس کی یہ ہنسی کچھ ایسی متعدی قسم کی ہوتی کہ لوگوں کے لئے اس کے ساتھ مسکرا دینے کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ جاتا۔

کچھ دنوں تک ساری باتیں خوش‌اسلوبی سے چلتی رہیں لیکن پھر ایک ایسی بات ہوئی جس نے فریقین کے تعلقات میں حد سے زیادہ کشیدگی پیدا کر دی۔ کافی عرصے تک چرکیئی کے نیک لوگوں کو خیموں میں رہنے والے ان افراد کے اصل مقصد کی ذرا بھی بھنک نہ لگ سکی حالانکہ وہ ان کی پراسرار سرگرمیوں کا قریب سے جائزہ لیتے رہتے تھے۔ یہ مقصد جس کا جانے کیوں ان لوگوں نے تذکرہ نہیں کیا تھا، اس چیز کے خلاف جو بہت ہی مقدس تھی، غداری ثابت ہوا۔ جی ہاں، یہ جپسی یا اور جو کچھ بھی تھے — ماہرین ارضیات، ماہرین پیمائش ارض، جغرافیہ‌داں... یہ لوگ ہر اس چیز کی، جو سب سے مقدس تھی، مضبوطی سے، غیرمتزلزل طور پر قائم تھی، جو پانچ سو برسوں سے زندگی کی بنیاد تھی، خلاف‌ورزی کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

"کیا کبھی کسی نے بھی ایسی کوئی بات سنی تھی؟"

"ارے نیک لوگو، کیا اس طرح کی باتیں بھی ممکن ہیں؟"

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ تو خالی خولی گپ معلوم ہوتی ہے۔"

"ہم اسے برداشت نہ کریں گے! ہم سوویت حکام سے اس کی شکایت کریں گے!"

"مگر تم سے کہا کس نے؟"

"مختدر کے بیٹے قیت‌مس نے۔"

"باپ ٹھہرا ضعیف العقل اور بیٹا اس معاملے میں باپ ہی پر پڑا ہے۔ تم نے بھی کس کی بات کا یقین کر لیا! جو شخص پتلون پہننے والی کسی لڑکی کے پیچھے عقل و ہوش کھو بیٹھے، وہ کچھ بھی سوچ سکتا ہے..."

"مگر اس سے کہا کس نے؟"

"اسی پتلون والی لڑکی نے۔"

"ہم بھی کس زمانے میں جی رہے ہیں!"

"بھئی، میں نے تو ان لوگوں کی آمد ہی پر تم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ کوئی اچھا شگون نہیں۔ اچھے لوگ ہوتے تو آ کے گاؤں کے اندر دوستوں کی طرح رہتے مگر یہ لوگ..." یہ بات عشورعلی نے چشمے کے کنارے گدےکن میں جہاں قابل احترام بڑے بوڑھے دھوپ میں بیٹھے اپنی بوڑھی ہڈیوں کو گرمی پہنچا رہے تھے، کہی۔ "مگر یہ لوگ، انہوں نے تو اخروٹ کے درخت کے نیچے کیمپ لگایا اور ہر شخص جانتا ہے کہ اخروٹ کے درخت کے تلے نہ سونا چاہئے ورنہ آدمی کا سر چکرانے لگتا ہے اب ان کے سر تیزی سے گھوم رہے ہیں..."

"ہم سے تو ابھی تک کسی نے کچھ پوچھا نہیں۔"

"ارے بھئی، ہم لوگ یہاں سے منتقل ہونے سے انکار کر دیں تو ہمیں کوئی مجبور تھوڑی کر سکتا ہے۔"

"ہمیں مجبور کرنے کا مطلب قانون کی خلاف‌ورزی کرنا ہوگا۔ آخر کون سا قانون اس کی اجازت دیتا ہے؟"

"بیکار الفاظ ضائع کرنے سے فائدہ؟ یہ محض بےبنیاد بات ہے۔"

"بےبنیاد کیوں؟"

"اب چپ بھی رہو، آگ کے بغیر کہیں دھواں نہیں اٹھتا۔"

"یہ بھی سچ ہے۔"

یہ ایک ایسی چیز تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا

اور کہستانیوں سے اس پر یقین کرنے کی بمشکل ھی توقع کی جا سکتی تھی۔

یہ کہ جہاں اس وقت گاؤں واقع تھا وہاں ایک زبردست سمندر بن جائے گا۔

یہ کہ سارا گاؤں غرقاب ہو جائے گا۔

یہ کہ اس جگہ ایک باندھ تعمیر کیا جائے گا۔

یہ کہ چرکیئی کے لوگوں کو ایک نئی جگہ، ایک نئے، جدید وضع کے گاؤں میں منتقل کر دیا جائے گا۔

یہ کہ پکی سڑکیں ہوں گی، سفید پشتے اور کوھساروں کی بلندیوں پر سفید بادبان ہوں گے، کوھساروں پر!

بوڑھے اور بچے

ناقابل فہم بات یہ تھی کہ ارضی تفتیش کرنے والے ان افراد نے آخر اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا تھا جو بہت ھی سنسان اور دوردراز تھی اور جہاں تک پہنچنے میں سخت دشواری ہوتی تھی۔ دراصل ان کا منصوبہ دونوں جانب کھڑی عمودی چٹانوں کے درمیان کنکریٹ کا ایک محرابی باندھ تعمیر کرنے کا تھا، اٹلس* کے سینے کی طرح۔ وہ اس باندھ کے ذریعے سولاک دریا کے پانی کو اس زبردست اور عمیق حوض میں اسیر کر لینا چاہتے تھے جسے دریا نے خود اپنے لئے تراشا تھا۔ اس باندھ کو دو سو تیس میٹر سے بھی زائد بلند ہونا تھا! اس طرح دو ارب سات لاکھ مکعب میٹر گنجائش کا ذخیرۂ آب وجود میں آنے والا تھا۔ بھلا کون تصور کر سکتا تھا کہ یہ کتنا پانی ہوا؟ ان کا کہنا تھا کہ اس پانی سے ۴ لاکھ ۳۰ ہزار ہیکٹر آراضی کی آبپاشی ہو سکے گی۔ اسی پانی سے جو اس وقت سولاک میں بہہ جاتا تھا، زبردست ٹربائنیں حرکت میں آئیں گی اور بجلی گھر کی پیداواری صلاحیت دس لاکھ کلوواٹ ہوگی! یہاں چیکا-سیزل-میئر کوھساروں پر بھلا کون

* قدیم یونانی دیومالا کے مطابق آسمان کو اپنے شانے پر اٹھائے رکھنے والا دیو۔ اڈیٹر۔

اس سب کا تصور کر سکتا تھا؟ ایسے بوڑھے لوگ بھی جنھوں نے کافی عرصہ قبل سے کسی بھی بات پر حیران ہونا ترک کر دیا تھا، ان باتوں پر حیرت ظاہر کرنے لگے:

"ھمارے زمانے میں کچھ بھی ممکن ہے۔"

"ہاں۔ یہ وقت کی بات تو ہے ھی۔"

"اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ دراصل عجیب وغریب بات تو ایک اور ھی ہے: ہم لوگ یہاں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ھیں اور ایک زمانہ وہ بھی آئے گا جب ان چٹانوں پر مچھلیاں بیٹھی باتیں کر رہی ہوں گی۔ ہے نا؟"

"مچھلیاں باتیں نہیں کر سکتیں۔"

"یہ تو مختدر کا خیال ہے نا۔ لوگ تو کہتے ھیں ڈولفینوں کی اپنی ایک الگ زبان ہوتی ہے۔"

"ڈولفین مچھلی کب ہوتی ہے۔"

"پھر کیا ہوتی ہے؟"

"جانور ہے۔"

"تم خود جانور ہو۔ ڈولفین سے زیادہ نیک تو کوئی ہوتا ھی نہیں۔"

"انسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"انسان ہر طرح کے ہوتے ھیں۔"

مختدر کان ڈھکنے کے پھٹے ہوئے پٹوں والی وھی ٹوپی پہنے ہوئے تھا جسے دیکھتے دیکھتے لوگوں کا جی اوب چکا تھا اور جس کے اون کو کہیں کہیں کیڑے صفاچٹ کر چکے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بڑی احتیاط کے ساتھ اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے ہموار اور چکنی کرنے کی کوشش کرتا تھا جیسے وہ ٹوپی کسی سستی کھال کی نہیں بلکہ عمدہ‌ترین سنہری قراقل سے بنی ہو۔ گدےکن میں وہ اپنے سر کو دوسروں کی بہ‌نسبت زیادہ برہنہ کرتا رہتا تھا جو کنجا تھا اور جس پر مارابو چڑیا کے مسوں کی یاد تازہ کرنے والے متعدد بڑے بڑے مسے واقع تھے۔ اس کی مسرور، مکار نظر آنے والی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کچھ اس قسم کی تھیں جنھیں کبھی بھی نہ سیر ہونے والی آنکھیں کہا جاتا ہے۔

جوانی میں وہ بہت تیز اور جوشیلا تھا لیکن پھر ایسا کچھ ہوا

که اس کا ایک بدمزاج بیوی سے سابقه پڑ گیا جس نے اس کی رنگ رلیوں کا خاتمه کر دیا۔ بےچاره رنگینیوں سے اپنی محرومی کا ماتم ان لفظوں میں کیا کرتا تھا: "میں کروں بھی تو کیا کروں، میری پہلی بیوی میں ایک خامی تھی، میری دوسری بیوی میں دو اور تیسری میں چار"۔ لوگ اس سے ہمدردی بھی کرتے تھے اور اس پر ہنستے اور مذاق بھی اڑاتے تھے لیکن مختدر کی کھال، اچھی طرح کمائے ہوئے چمڑے کی طرح موٹی تھی اور اس پر ان باتوں کا خاک بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔

"لیکن نیک لوگو، اب یه بتاؤ که ہمارے قبرستان پر کیا بیتے گی؟" عشورعلی نے اچانک کہا۔ "ہم تو خیر زنده ہیں، وه لوگ ہمارے ساتھ جو کچھ بھی چاہیں کر سکتے ہیں لیکن مردے... دنیا سے کوچ کر جانے والے ہمارے آبا و اجداد کا کیا حشر ہوگا؟"

"ان کے آرام میں مخل ہونے کی بھلا کون ہمت کر سکتا ہے؟"

"نہیں، وه اپنے ورثا کے ہاتھوں اس نوعیت کی ناشکرگزاری کو برداشت نه کر سکیں گے۔"

"تمہارا خیال ہے که وه لوگ اپنی قبروں سے باہر نکل کے احتجاج کریں گے؟!" مختدر کے ہونٹوں پر ایک طنزیه مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ارے وه نہیں، ان کی یاد احتجاج کرے گی، نالهوزاری کرے گی، شدید غصے سے کپکپائے گی۔ یه بات میں تم سے کہے دے رہا ہوں، میں کتاگن قبیلے کا عشورعلی!"

"لیکن ان کی یاد ہے کہاں؟" اگر یه انہی رنگ برنگے چیتھڑوں میں بسی ہوئی ہے جنہیں لوگ مقدس درختوں پر لٹکاتے ہیں، تو یه بڑی معمولی قسم کی یاد ہوئی!"

"ارے کفر مت بکو، شیطان کے بیٹے" عشورعلی نے مختدر کی طرف ایک تیز نگاه ڈالی تو اس کی آنکھیں تنگ ہو گئیں۔ "ہمارے آبا و اجداد کی یاد ہمارے اندر موجود ہے۔ یه انہی کا خون تو ہے جو ہماری رگوں میں جاری ہے اور ان کا خون جاری ہے، تو اس کا مطاب یه ہے که وه زنده ہیں، ان کی یاد زنده اور جاوداں ہے۔"

"جاوداں تو صرف آفتاب ہے!"

"وه لوگ یہاں ایک آفتاب کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ایسا کرنے دو لیکن اس کا ہمارے گاؤں سے آخر کیا تعلق ہے؟" سونے

کے دانتوں والے ربادان نام کے بوڑھے نے ذرا غور و خوض کے بعد کہا۔ یه وہی شخص تھا جس کے بچھڑے کو گزشته روز بھیڑیوں نے ہلاک کر دیا تھا۔ لوگوں نے مذاق میں اس کا نام "مہمل" رکھ چھوڑا تھا کیونکه وه اس لفظ کو بار بار استعمال کرتا تھا اور اس وقت بھی اس نے اپنی بات کے آخر میں کہا "مہمل!"

"وه لوگ تمہارے فائدے ہی کی سوچ رہے ہیں..."

"فائدے کی بات ہے تو آخر وه ہمارے غصے کو کیوں بھڑکا رہے ہیں؟" امیرخان نے پوچھا۔

"آخر ہم انسان ہیں که نہیں؟ آؤ، سب لوگ ساتھ ساتھ چلو" عشورعلی اپنے ڈنڈے کا سہارا لیتا ہوا تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے افعال کی طرح اس کی حرکات بھی فوری ہوتی تھیں۔

"مگر کہاں؟" لنگڑے عثمان نے پوچھا۔

"سوویت حکومت کے پاس، سلطنت کے پاس، وه بتائے که آخر یه قصه کیا ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے محترم عشورعلی، بالکل ٹھیک ہے۔ پارٹی تنظیم کے سکریٹری کو بھی معاملے کی وضاحت کرنی چاہئے۔"

"پارٹی تنظیم کا سکریٹری یہاں نہیں ہے، وه تو آج چراگاہوں پر چلا گیا۔"

"آؤ چلیں ہر بات کی صاف طور سے وضاحت کرا لیں" دنگیر – دنگارچو نے کہا جو اس وقت زنده تھا اور اپنی موت کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ وه زنده تھا اور آفتاب اسے گرمی و توانائی پہنچا رہا تھا۔

"سلطنت ہے تو سلطنت ہی سہی" مختدر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تو خوشی خوشی اس کے پاس جاؤں گا، اسے تو ایک نظر دیکھ لینا ہی کافی ہوتا ہے، ہر شے کچھ زیاده منور سی معلوم ہونے لگتی ہے۔"

"اور اس کا شوہر حسریت بھی وہاں ہوا تو کیا ہوگا؟"

"اس کے ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ وه مجھے سلطنت کو دیکھ کر مسرت حاصل کرنے سے روک تھوڑی سکتا ہے؟"

چنانچه بڑے بوڑھے چٹانوں کے کسی شگاف جیسی تنگ گلی پر ایک قطار میں چل کھڑے ہوئے۔ عشورعلی قیادت کر رہا تھا۔ دنگیر – دنگارچو، لنگڑا عثمان، ربادان، چنتارئی، امیرخان، مختدر،

علی، ولی، شفیع، رفیع اور اشرفی پیچھے چل رہے تھے۔ میں کہنا چاہوں گا کہ دوسرے لوگ بھی تھے لیکن دوسرے لوگ نہیں تھے کیونکہ بچے بھلا کس شمار میں ہوتے ہیں۔ بچے – لٹکے ہوئے کانوں اور حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں والے، صاف ستھرے ہوں یا گندے، ننگے پیر، ننگے بدن – بچے بہرحال بچے ہیں۔ وہ ابھی زندگی کو کیا جانیں ویسے جلد ہی سب کچھ جان ضرور جائیں گے۔ بچے سوچتے ہیں کہ بوڑھوں کا وقت بہت مزے سے کٹتا ہے اور بوڑھے بچوں کے بارے میں یہی سوچتے ہیں۔ انہیں سوچنے دیجئے، خیالات سے ذہن کو بہرحال فروغ حاصل ہوتا ہے۔

وہ لوگ سیدھے گاؤں سوویت کی عمارت کی طرف چلے جو کمزور لیکن کشادہ دو منزلہ مکان تھا اور دوسری منزل کی بالکونی پر کسی سجاوٹ والی چیز کے بغیر لکڑی کی سادی سی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کے مضبوطی سے قدم اٹھا رہے تھے اور دل ہی دل میں اس بات پر کچھ برہم سے تھے کہ ان کے فیصلے نے انہیں اس اقدام پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی گدے‌دار جیکٹ پہنے ہوئے تھا تو کوئی پوستین اور کوئی جدید وضع کا سوٹ جو پرانا ہو چلا تھا۔ دراصل کہستانی علاقے میں کسی قابل احترام معمر شخص کے لئے یہ نازیبا بات تصور کی جاتی تھی کہ وہ نیا سوٹ پہن کے اکڑتا پھرے۔ نیا خریدا ہوا سوٹ پہننے سے قبل وہ کچھ دنوں تک پہننے کے لئے کسی کم عمر والے کو دے دیا کرتا تھا۔ وہ خود نیا سوٹ پہنتا بھی تو اندھیرا ہونے کے بعد جبکہ کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس طرح دو ایک ہفتے تک اندھیرے میں پہن لینے کے بعد ہی کہیں جا کے وہ دن میں اسے پہن کے باہر نکلتا تھا۔ اس طرح کے کسی بڑے بوڑھے کو نئی چیزوں اور نئے طریقوں کے فوائد سمجھانے کی ذرا کوشش کر کے تو دیکھئے! بعض افراد زمانہ جنگ کے نمونے کی برجیسیں پہنے ہوئے تھے۔ جنگ کو ختم ہوئے خاصا وقت گزر چکا تھا لیکن سپاہیوں کے لباس سے ان لوگوں کو اب بھی ایک خاص نوعیت کی محبت سی تھی۔ کچھ لوگ البتہ بڑی شاندار پاپاخائیں پہنے ہوئے تھے۔ جی ہاں، اب تو لوگ عمدہ‌ترین قراقل کی پاپاخائیں سلا رہے تھے! نئی پاپاخا استعمال کرنا بالکل دوسری بات تھی، یہ تو آن بان اور فخر کا معاملہ تھا۔ ویسے کچھ لوگ جھبرے بالوں کی سستی پاپاخائیں بھی پہنے ہوئے

تھے۔ ان لوگوں کو گزرتے دیکھ کر بچے بھیڑ کی شکل میں اکٹھا ہو کے ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ان کا خیال تھا کہ بوڑھوں کو تشویش ہے تو کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔

گاؤں سوویت کی چیرمین سلطنت

گاؤں سوویت کے دفتر کے کھلے ہوئے دریچے سے آواز باہر سنائی دے رہی ہے: "ہاں ہاں، یہ میں بول رہی ہوں۔ میں کون ہوں؟ چرکیئی گاؤں سوویت کی چیرمین۔ ہاں، میں عورت ہوں... سنو بدصورتوں میں بغیر مونچھوں والے حسین، کیا یہ تمہارا ٹریکٹر ہے جو ہماری موسم سرما کی چراگاہوں کو برباد کر رہا ہے؟.. تم نے کبھی مجھ سے پوچھا بھی؟ تم ارضیاتی تفتیش کرنے والے نہیں، ارضیاتی چیر پھاڑ کرنے والے ہو... اور تم اپنی یہ نرم باتیں اور تعریفی کلمات اپنے ہی تک رکھو تو اچھا ہے... اچھی بات ہے، میں اپنے شوہر کو بھیج دوں گی... وہ تمہیں مزہ چکھا دیں گے۔ کیا کہا؟ جہنم میں جاؤ!" ریسیور زور سے رکھ دیا گیا۔ ہاں، بولنے والی سلطنت ہی تھی۔ یہ تھی اس کی نرمی اور نزاکت! ایسی سخت باتیں پل بھر تک سنئے تو کان پناہ مانگنے لگیں۔ لیکن ایسی باتیں زیادہ سننے کو نہیں ملتی تھیں۔

"اب یہ باہر سے کیسی آوازیں آ رہی ہیں؟" سلطنت نے اپنے سکریٹری ابالا عبدالعرشی سے پوچھا جو بہت زیادہ دبلا پتلا، پستہ‌قد نوجوان تھا۔ کچھ عرصہ قبل وہ اسے مویشیوں کے فارم میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے نوکری دلانے کے لئے اجتماعی فارم کے چیرمین سے بات کرنے والی تھی لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔ "مجھے یہاں سے فارم کو نہ بھگائیے۔ یہیں رہنے دیجئے۔ سلطنت، مجھے چاہے کوئی اجرت نہ ملے لیکن میں تو صرف یہیں کام کروں گا۔" اس لئے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا لیکن حیرت میں پڑ گئی کہ آخر یہاں اسے کون سی چیز روکے ہوئے ہے، آخر یہ جوان غیرشادی شدہ آدمی صرف یہیں کیوں کام کرنا چاہتا ہے؟ اسے جلد ہی پتہ چل گیا۔ اوہ مردو، آخر تمہیں قوی صنف کیوں کہا جاتا ہے؟ اس نے کسی نہ کسی طرح سلطنت

کی ایک تصویر حاصل کر لی تھی جسے وہ اپنے پاس رکھتا اور اکثر نکال کے دیکھتا رھتا تھا۔ اس کی صرف ایک ھی خواھش تھی اور وہ یہ کہ سلطنت کے چہرے پر اپنی نگاھیں نثار کرتا رھے...
"بےچارہ غم نصیب ابالا عبدالعرشی" آپ کہیں گے۔ "بےچارہ کیوں؟ ارے نہیں، میں تو دھرتی کا مسرورترین آدمی ھوں! تابناک آفتاب مجھ پر اپنا نور بکھیرتا ھے!" وہ چیخ کے جواب دےگا۔
"کچھ لوگ آئے ھیں، کامریڈ سلطنت!" سکریٹری نے جو اس کی معمولی سی معمولی خواھش کو پوری کرنے کے لئے ھمہ‌وقت تیار رھتا تھا، دریچے سے باھر جھانکتے ھوئے جواب دیا۔ آپ فقرہ "کامریڈ سلطنت!" پر ذرا غور کیجئے۔ کاش آپ سن سکتے کہ وہ "کامریڈ سلطنت" کس انداز سے کہتا ھے! وہ ان الفاظ سے صرف اسی کو نہیں اس کے شوھر کو بھی مخاطب کیا کرتا ھے: "کامریڈ حسریت"۔ وہ اس کے شوھر پر فخر کرتا، اس کی کامیابیوں پر خوش ھوتا اور بڑی مسحور ھونے والی نگاھوں سے اسے دیکھتا ھے۔ اس کے ان بڑے بڑے ھاتھوں کو دیکھتا ھے جنھیں سلطنت کو بھینچ لینے کا، پیار کرنے اور اس کے بالوں کو سہلانے کا حق حاصل ھے۔ اس کے ھونٹوں کو دیکھتا ھے جو آفتاب کا بوسہ لے سکتے ھیں اور ساری دنیا میں صرف انھی کو یہ حق حاصل ھے۔ ویسے وہ کبھی کبھی حسریت پر کچھ ناراض سا بھی ھو جاتا ھے جب وہ دو ایک گلاس شراب چڑھا کے دفتر آ جاتا ھے، جب وہ جیسا کہ کہستانی لوگ کہا کرتے ھیں، بھدی دھن کے لئے نازک تاروں کو چھیڑتا ھے اور سلطنت کے پاس اس کے دفتر میں اسے اپنی بیوی سمجھ کے آتا ھے... کتنی بےمحل بات ھے یہ! دفتر میں تو وہ اس کے شوھر کو رشک کی نگاھوں سے دیکھتا ھے۔ کام کے بعد گھر میں اس کا جو جی چاھے کرے لیکن یہاں دفتر میں...
"یہ تو میں بھی سن رھی ھوں کہ لوگ ھیں مگر کون لوگ ھیں؟" سلطنت نے کاغذ سے نظریں اٹھاتے ھوئے دریچے کے قریب کھڑے سکریٹری کو دیکھا۔
"بوڑھے اور بچے، بچے اور بوڑھے۔"
"وہ چاھتے کیا ھیں؟" سلطنت نے پوچھا اور برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔

چرگیئی کے بڑے بوڑھے، معزز افراد ایک مشترک خیال کے ساتھ گاؤں سوویت کے احاطے میں داخل ھوئے۔ یہ ایک کشادہ احاطہ تھا جہاں دیواروں کے کنارے کنارے بنچیں رکھی ھوئی تھیں۔ گاؤں کے تمام اھم اجتماعات یہیں ھوا کرتے تھے اور بڑے بوڑھے طرح طرح کی ناخوشگوار افواھوں کا ھمیشہ کے لئے خاتمہ کرنے کے عزم کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ وہ زور زور سے باتیں کر رھے تھے اور ایک دوسرے کو ٹوک رھے تھے لیکن اتنے میں سلطنت نرمی سے مسکراتی ھوئی برآمدے میں آئی۔ اس نرمی نے اس کے چہرے کو بےمثال حسن عطا کر دیا تھا۔
"بھئی، ھمارے پاس آؤ۔ یہاں آؤ..." بڑے بوڑھوں میں سے کچھ بنچوں پر، کچھ آگے کو نکلے ھوئے پتھروں پر اور کچھ درخت کے ایک ٹیڑھے تنے پر بیٹھ گئے جو اتنا موٹا تھا کہ تین آدمی اپنے بازوؤں سے اس کا بمشکل احاطہ کر سکتے تھے۔ اسے کراکن گھاٹی سے بارہ بیل گھسیٹ کے لائے تھے لیکن عمارتی لکڑی کی حیثیت سے بےمصرف ثابت ھوا تھا۔ اس سے مویشیوں کو پانی پلانے کے لئے عمدہ سی ناند بن سکتی تھی یا پھر اسے کھوکھلا کر کے ریڈ انڈین کشتی بنائی جا سکتی تھی۔
سلطنت سیڑھیاں اترتی ھوئی بالکل نیچے والی سیڑھی پر آ کھڑی ھوئی۔ الجھن اور شرم نے اس کے چہرے کو کچھ اور زیادہ سرخ کر دیا تھا اور اس تبدیلی کو برآمدے میں کھڑے ھوئے ابالا عبدالعرشی کی نگاھوں نے فوراً ھی محسوس کر لیا۔ اتنے میں ایک گندہ، چھوٹا لڑکا اچانک دوڑتا ھوا اس کے پاس آیا اور کہا:
"اے گاؤں سوویت کی چیرمین سلطنت، اب اور آگے نہ بڑھئے، یہ لوگ آپ کو مارنا پیٹنا چاھتے ھیں۔ میں نے یہ بات ان کے منہ سے سنی ھے۔ کہہ رھے تھے: "ھم اسے جھنجھوڑ کے سب کچھ اگلوا لیں گے جیسے دری جھاڑی جاتی ھے!"
ابالا عبدالعرشی نے یہ بات سنی اور دوسرے ھی لمحے لپک کے اپنی چیرمین کے سامنے جا کھڑا ھوا۔ وہ مارنے مرنے کو تیار نظر آ رھا تھا: "خبردار، جو کسی نے ان پر ایک انگلی رکھنے کی بھی کوشش کی۔" سلطنتِ نے اس کے شانے پر ھاتھ رکھ کے مسکراتے ھوئے، دھیرے سے اسے ایک طرف ھٹا دیا اور آنے والوں سے مخاطب ھوئی:

"کھئیے بزرگو، آپ میرے پاس کس کام سے آئے ھیں؟"

"گاؤں سوویت کی چیرمین سلطنت، ھمیں تم سے ایک سوال پوچھنا ھے" عشورعلی نے ذرا آگے بڑھتے ھوئے کہا۔

"تو پوچھئیے نا، کتاگن قبیلے کے معزز عشورعلی" سلطنت نے کہا اور اس کے موتی جیسے دانت دکھائی دئے۔

"کیا یہ سچ ھے؟" عشورعلی نے داڑھی پر ھاتھ پھیرتے ھوئے پوچھا۔

"کیا سچ ھے؟" سلطنت کی نیک اور فیاض آنکھیں نرمی سے چمک اٹھیں۔

"یہی جو کچھ ھمارے کانوں نے سنا ھے، جو گاؤں پر چلنے والی ھواؤں میں بسا ھوا ھے، جو کسی سرد سانپ کی طرح ھماری روحوں میں رینگ رھا ھے، جس نے ھمیں اپنے آبا و اجداد کی یاد کے سامنے شرمندہ کر دیا ھے کیونکہ کہا جا رھا ھے کہ وہ لوگ اس جگہ کو غرقاب کرنا چاھتے ھیں نیز یہ کہ ھمارے اوپر" اور عشورعلی نے اپنے ڈنڈے سے اوپر کی طرف اشارہ کیا، "ایک سمندر ھوگا۔"

"جی ھاں، معزز بڑے بوڑھو، یہ سچ ھے" اس نے کچھ چھپانے کی کوشش کئے بغیر کھلم کھلا کہا اور ان لوگوں نے اس کے الفاظ انتہائی مایوسی کے ساتھ سنے۔

"اور یہ کہ ھم لوگوں کو یہاں سے الگ منتقل کر دیا جائےگا..."

"یہ بھی سچ ھے۔"

"اور ایک باندھ تعمیر کیا جائےگا۔"

"جی ھاں۔"

"اور یہاں کی ھر چیز پانی میں ڈوب جائےگی؟" اس نے اپنے ھاتھ پھیلا دئے۔

"جی ھاں" سلطنت نے جواب دیا۔

"تو پھر سب کچھ سچ ھے" عشورعلی نے گہری مایوسی سے کہا اور سب پر غصے سے بھری ھوئی نظریں دوڑائیں۔ اس نے سلطنت کی طرف اپنی پیٹھ کر کے، کچھ اور کہنے کے متعلق سوچا پھر ارادہ بدل کے اپنے ھاتھ جھٹک دئے۔ "لوگو، چلو یہاں سے!" اس نے کہا اور

پوری طرح کھلے ھوئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی ان امیدوں پر کہ یہ ساری باتیں خالی خولی گپ تھیں، پانی پھر گیا تھا۔

دوسرے افرادِ حیران و پریشان کہ آخر معمر عشورعلی نے بات‌چیت کا سلسلہ اچانک کیوں ختم کر دیا، اس کے پیچھے پیچھے چل کھڑے ھوئے۔ ایک بات بہرحال یقینی تھی اور وہ یہ کہ اسے اتنے قطعی جواب کی توقع نہیں تھی اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس بےنتیجہ گفتگو کے بعد بہترین بات یہی ھے کہ واپس جا کے آئندہ اقدام پر غور و خوض کیا جائے۔

"میرا تو خیال تھا کہ جھگڑا ھوگا" چھوٹا لڑکا مایوسی سے بڑبڑایا۔ اس نے آستین سے ناک پونچھی اور بوڑھوں کے پیچھے دوڑ پڑا۔

کھانے کا وقت ھو چکا تھا اس لئے سب لوگوں سے رخصت ھوتے ھوئے عشورعلی نے کہا:

"بھئی، سب کے کان ھیں، سب نے سن لیا۔ اب ھم سب کو سوچنا چاھئیے کہ تباھی سے بچنے کے لئے کیا اقدام کیا جائے۔ جہاں تک میں سمجھتا ھوں، یہ معاملہ خاصا آگے بڑھ چکا ھے اور جتنا ھم سمجھتے تھے اس سے کہیں زیادہ سنگین ھے۔ اس لئے سب لوگ کچھ سوچیں..."

"اس لئے سب لوگ سوچیں" مختدر نے عشورعلی کی نقل اتارتے ھوئے کہا۔ "سوچو، تم لوگ جتنا ممکن ھو سکے دماغ لڑاؤ۔ جہاں تک میرا تعلق ھے میں تو کل کا بھنا گوشت ختم کرنے جا رھا ھوں۔ کیوں بھئی، کوئی چلتا ھے میرے ساتھ؟ آؤ، چلیں دنگیر - دنگارچو، ھم لوگ چائے پی کے خود کو ذرا گرمی پہنچائیں گے۔" دنگیر - دنگارچو اس وقت زندہ تھا اور اپنے اندر کے آفتاب کو دھرتی پر بلند کئے ھوئے تھا۔

سڑک جو ایک نغمہ ھے

چرکیئی کے لوگوں کو اس رات ٹھیک سے نیند نہ آئی، اس کے بعد کئی راتوں تک یہی صورت رھی۔ ان کے سالہا سال پرانے طرزِ زندگی کو جو خطرہ لاحق تھا اس کے مدنظر یہ کوئی حیرت کی

بات بھی نہ تھی۔ آنے والی خوشگوار تبدیلی کے تصور سے صرف ایک شخص خوش تھا ـ سلطنت کا شوہر حسریت جسے اپنی انجینیرنگ تربیت کے لئے اس علاقے میں یقیناً کافی مواقع نہیں مل رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس علاقے میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور صرف سلطنت کی محبت ھی اسے وھاں روکے ہوئے تھی حالانکہ کہستانی آدمی کی حیثیت سے وہ بالکل فطری طور پر کبھی بھی اس محبت کا مظاھرہ نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس بعض اوقات موقع میسر آ جانے پر وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بیوی پر حاوی ھے اور بیوی کی فرض شناس فرمانبرداری پر زور دیتا۔ "دیکھا وہ کس طرح میرا حکم مانتی ھے، گاؤں سوویت کی چیرمین ہونے کے باوجود" اور سلطنت واقعی اس کی ہر خواھش پوری کرتی رھتی تھی۔

پھر ایک بےرونق، ناخوشگوار صبح کو چرکیئی کے لوگوں نے اجنبیوں کے کیمپ کی طرف دیکھا اور اسے غائب پایا۔ نہ کہیں خیمے تھے نہ افراد۔ صرف الاؤ کے نشانات اور ھلکی بارش سے گیلی ھو جانے والی راکھ سے اس بات کا ثبوت ملتا تھا کہ اس جگہ کبھی لوگ رھا کرتے تھے۔ اسی روز مختدر کا بیٹا قیت‌مس بھی غائب ھو گیا۔ اس کا ٹرک اجتماعی فارم کے گیراج میں اکیلا کھڑا تھا۔ "ھم لوگ بھی کتنے عجیب و غریب زمانے میں زندگی بسر کر رھے ھیں جبکہ پتلون پہننے والی لڑکیاں گاؤں کے اچھے خاصے نوجوانوں کا اغوا کر سکتی ھیں!" کسی شخص نے گدےکن میں تبصرہ کیا جس کا جواب مختدر نے نہایت ھی طنزیہ مسکراھٹ کے ساتھ دیا: "بھٹی، آدمی اپنے سر سے پتھر کو مارے یا پتھر سے سر کو، فرق ھی کیا پڑتا ھے! میں نے تو کبھی سوچا تک نہ تھا کہ قیت‌مس اتنا احمق ھوگا!"

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا اعتماد بحال ہونے لگا اور ان کی تشویش گھاٹیوں کی خلاؤں میں کھو جانے والے صبح کے کھرے کی طرح غائب ھو گئی۔ ان کی پرسکون روزمرہ زندگی کے عام مسائل نے ان کے حافظے سے بہت کچھ کھرچ پھینکا۔ انھوں نے گھر بیچے بھی خریدے بھی، نئے گھر تعمیر کئے اور اپنے چھوٹے چھوٹے قطعات آراضی پر نئے اشجار لگائے۔ بچے پیدا ہوئے اور بوڑھوں نے دنیا کو خیرباد کہا۔

قصہ مختصر یہ کہ سب کچھ ویسے ھی ہونے لگا جیسے ہمیشہ

ہوتا رہا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بھی کروٹ لینے لگا کہ خیموں میں رہنے والے افراد چونکہ بہت اچانک طور پر چلے گئے ہیں اس لئے شاید انہیں یہ جگہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے ناموزوں معلوم ہوئی ہو، شاید وہ لوگ کہیں کوئی اور جگہ تلاش کر رہے ہوں: عمیق تیریک ندی کے کنارے، قزلیار کے پاس یا سامور دریا پر۔ سامور ڈیلٹا میں زبردست تبدیلیوں کے منصوبے کے متعلق اخباروں میں بھی تو کچھ شائع ہوا تھا نا؟

خیموں میں رہنے والوں کی روانگی کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد تک کوئی بھی اس جگہ پر نہ آیا جہاں ان لوگوں نے کیمپ قائم کیا تھا اور لوگ دھیرے دھیرے اس سارے قصے کو بھول گئے۔ اب گفتگو کے دوران اس مسئلے کا تذکرہ آتا بھی تو محض مذاق کے طور پر۔ لوگ باندھ کی تعمیر کی افواہوں کو یاد کرتے تو یوں جی کھول کے قہقہے لگاتے جیسے کسی احمقانہ خیالی منصوبے پر ہنس رہے ہوں۔

"ارے مختدر، ہو سکتا ہے کہ تمہارا بیٹا اس سمندر میں ڈوب گیا ہو جو یہاں ہمارے سروں پر موجود ہے، کیوں ٹھیک ہے نا؟" امیرخان نے گدےکن میں اپنی آنکھوں کو پراسرار طور پر تنگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ذرا سنو تو، آخر یہ نیا چرکیئی خود کو کس طرح پیدا کر رہا ہے: سر کی طرف سے یا پیر کی طرف سے؟"

"کہو، کہاں گئے تھے؟ چیکا - سیزل - میئر کوہساروں میں واقع نئے سفید قصبے کو؟ ہا۔ ہا۔ ہا!"

"تم نے باندھ دیکھا؟ اور وہ سفید بادبان؟ ارے دنگیر - دنگارچو، وہ تمہی تو تھے نا، آج صبح کشتی پر بیٹھے مچھلیوں کا شکار کرتے ہوئے؟"

"پانی کی بھیڑ کے کباب کس کو چاہئیں؟" مختدر نے امیرخان کی طرف غصہ بھری نگاہوں سے دیکھا لیکن وہ بھی دوسروں جیسے موڈ میں آ گیا۔ "پانی کی بھیڑ... میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس قسم کا فقرہ استعمال کروں گا۔"

"ذائقہ‌دار ہے نا؟"

"عمدہ اور موٹی تازی۔ ہا۔ ہا۔ ہا!"

لیکن ان کے لئے کتنی تلخی اور جھنجھلاہٹ کی بات تھی کہ ان

کے تمام مذاق، خیالات اور دانشمندانہ فقرےبازیاں، سب کچھ قبل از وقت ثابت ہوا اور جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ وہ بہت زیادہ غلطی پر تھے- اور باعزت بڑے بوڑھوں کے لئے ایسی زبردست غلطی پر ہونا، کیا ان کے شایان شان تھا؟ ان کی دوربینی اور معاملہفہمی ان کے لئے کتنی ناکام ثابت ہوئی تھی! یہ تو وقار سے گری ہوئی، نادم اور پریشان کرنے والی بات تھی- بڑے بوڑھے الجھن اور پریشاں خیالی میں مبتلا ہو کے رہ گئے تھے- اب تک جو پرسکون فضا قائم تھی اس کی حیثیت ان اجاڑ اور سنسان علاقوں میں طوفان سے قبل کے سناٹے کی سی تھی- طوفان جو بڑی سنگین نوعیت کا تھا اور جسے پن بجلی گھر تعمیر کرنے والے پوری تیاری کے ساتھ لانےوالے تھے... اس کا آغاز موسم گرما کی ایک عام صبح کو ہوا جبکہ چپکا - سیزل - میئر کوہساروں کا سارا علاقہ درجنوں بھاری ٹرکوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا- چیر - یورتا میں تعمیراتی کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا اور تمام طاقتور مشینوں اور عارضی رہائشی بیرکوں کو یہاں منتقل کیا جا رہا تھا- زمین ہلنے لگی، مکانوں کے دریچے کھڑکھڑائے اور آقسو اور سولاک دریاؤں کا شور تک ٹرکوں کے شور میں دب کے رہ گیا- چوٹیوں کی ڈھلانیں، دل شکستہ کرنے والی چٹانی ڈھلانیں اپنے چھوٹے چھوٹے کھیتوں اور زنگ جیسی گھاس سمیت، جاگ اٹھیں-

وقت کا تقاضا تھا اور فوری اہمیت کے کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جانا تھا، وہ کام جن میں تاخیر کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی- مثال کے طور پر ایک سڑک جس کی سب سے پہلے ضرورت تھی لیکن کوہساروں میں سڑک کی تعمیر کا مطلب معلوم ہے؟ چالیس ہزار روبل - صرف ایک کلومیٹر سڑک تعمیر کرنے کے لئے!.. ٹھیک ہے، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہم تعمیراتی کارکن ہیں! خراب سڑک زندگی کو مختصر کرتی ہے- زندگی ایک سڑک ہے اور سڑک زندگی- ہمیں ایک سڑک چاہئے- کوہساروں کے سینے میں ایک نئی زندگی کی آمد آمد ہے-

"ارے یہ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"چرکیئی-"

بلندیوں پر واقع مواضعات سے، وادیوں میں واقع مواضعات سے

اور شہروں سے لوگ صاف شفاف کہستانی نالوں کی جیسی تیزرفتاری سے پہنچنے لگے- یہ جوشیلے جوان افراد کی ٹیمیں تھیں کیونکہ اس تعمیر کو کومسومول کا محنت و جرأت کے مقابلے کا کام قرار دیا گیا تھا- پہلے خیموں کی ایک بستی آباد ہوئی پھر لوگوں کی عارضی رہائش کے لئے بیرکیں تعمیر کی گئیں- اس بستی کا نام "دوستی" رکھا گیا- لیکن یہ تو بتائیے کہ یہ مہمجو، جوان افراد کوئی دوسرا نام نہیں تلاش کر سکتے؟ آخر وہ دوسرا نام کیوں رکھیں؟ بھئی بات یہ ہے کہ یہ بڑا فرسودہ سا نام ہے! جی نہیں، صرف "دوستی"! ذرا آپ ان جوان افراد سے جن کا رنگ دھوپ میں سنولا گیا ہے، جو سینوں پر کومسومول کے بلے لگائے ہوئے ہیں، پوچھئے تو کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں- یہ لوگ اچھی خاصی درجن بھر قومیتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور انہوں نے خود ہی اپنی بستی کا نام اور اس کا نشان جو گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے ہاتھ ہیں، منتخب کیا ہے- لیکن ایسی بات پر زور دینے کی ضرورت ہی کیا ہے جو ایک مانی ہوئی حقیقت ہے اور جس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں؟ اس لئے کہ یہ لفظ ایک عہد، ایک قسم کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اپنی تکرار سے فرسودہ نہیں بلکہ کچھ اور زیادہ تابناک ہو جاتا ہے-

آپ بہت سی آوازوں کی ملی جلی چیخ پکار سن سکتے ہیں:

"آج یوم مئی ہے! فرمانروائے وقت مزدور طبقہ زندہ باد! ہرا ساتھیو! اپنے دستوں کو منظم رکھو- لیکن نغمے کا کیا ہوگا؟ ہمیں کوئی نغمہ چھیڑنا چاہئے!"

"کون سا؟"

"نمانگان کا سیب-"

"ماسکو کے مضافات کی شامیں-"

"سولیکو-"

"زندگی، تجھ سے محبت ہے مجھے..."

"لیکن زندگی سے محبت کون نہیں کرتا؟"

"کہستانی پگڈنڈی پر..."

"کشادہ دنیپر..."

"لیکن سولاک دریا زیادہ گہرا ہے-"

چیکا - سیزل - میئر کوهساروں پر زندگی موجیں مار رہی تھی، جوش میں آئی ہوئی تھی۔ کہستانی لوگ اس تمام شور اور بھاگ دوڑ کے عادی نہ تھے اور ہر طرف زبردست اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ نہ دن کو چین میسر تھا نہ رات کو۔ کیا دنیا ختم ہونے جا رہی تھی؟ نہیں، یہ خاتمہ نہیں، آغاز تھا۔ لوگ دھرتی کو مشینوں سے لیس کر رہے تھے اور کہا جا رہا تھا کہ جلد ہی راکٹوں پر دوسری دنیاؤں کو پرواز کرنے کی ضرورت نہ رہ جائے گی۔ لوگ دھرتی کی گردش کا رخ متعین کریں گے اور اسی دھرتی پر کسی زبردست جہاز کی طرح کائنات میں گھومتے پھریں گے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آفتاب سے محروم ہونا چاہتے ہیں؟ نہیں، وہ تو دھرتی پر خود اپنے ایک آفتاب کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن تب بھی آفتاب سے محروم نہیں ہوا جا سکتا۔ کچھ بھی ممکن ہے، اس شور و غل اور ہلڑ ہنگامے میں کچھ بھی واقع ہو سکتا ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ بڑے شہروں میں شور و غل کے باعث زندگیاں مختصر ہوتی ہیں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ دس بیس سال بعد ٹوکیو میں رہنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسی خودکار مشینیں بن چکی ہیں جو پیسے لے کر تازی ہوا فروخت کرتی ہیں۔

"کیوں بھئی سنا تم نے؟ قیتمس اپنی پتلون پہننے والی بیوی کے ساتھ واپس آ گیا ہے۔"

"ارے نہیں!"

"بالکل سچ، خدا کی قسم، میں نے ان دونوں کو اسی طرح صاف طور پر دیکھا جیسے اس وقت تم کو دیکھ رہا ہوں۔ ہم لوگوں نے دو چار باتیں بھی کیں۔ میں نے کہا: "ارے یہ تم ہو؟" اور اس نے جواب دیا: "ہاں، یہ میں ہی ہوں۔" پھر میں نے پوچھا: "کیا تم قیتمس نہیں ہو؟" اور اس نے جواب دیا: "ہوں کیوں نہیں۔" تب میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا: "شاباش!" اور اس نے؟ اس نے اور کچھ بھی نہ کہا اور جائے تعمیر پر چلا گیا۔ میں نے اس کی بیوی سے بھی ہاتھ ملایا۔ وہ واقعی بےحد خوبصورت ہے اور اس کے بالوں کا رنگ گیہوں کی پکی ہوئی بالیوں جیسا ہے۔"

یہ بھی عجیب و غریب زمانے ہیں کہ بیٹوں کے جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں اور اپنے بزرگوں سے پوچھتے تک نہیں۔ ہاں گاؤں کے یہ بزرگ اور بڑے بوڑھے بری طرح مایوس ہو چکے تھے، اتنے زبردست پیمانے پر ہونے والی تعمیری سرگرمیوں سے گونگے بہرے سے ہو کر رہ گئے تھے، اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھے: یہ باہر سے آنے والے لوگ نیا چرکیئی تعمیر کر رہے تھے اور مزدوروں کے لئے دبکی نام کا ایک قصبہ۔ یہ لوگ پن بجلی گھر تعمیر کر رہے تھے۔ رات کے وقت درجنوں ٹرکوں کی روشنیاں کوهساروں کے پہلوؤں میں ایسی جگہوں پر پڑتی تھیں جہاں اس سے قبل کبھی انسانی قدم نہیں پڑے تھے۔ دن میں ان کے ہارنوں کی آوازیں گھاٹیوں میں دور دور تک گونجتی رہتی تھیں۔ چیکا - سیزل - میئر کے اس اجاڑ اور نظرانداز کئے ہوئے علاقے تک پہنچنے کے لئے اب جمہوریہ بھر میں بہترین اور مضبوط‌ترین سڑکیں موجود تھیں۔ کشادہ اور پائیدار کنکریٹ اور اسفالٹ کی یہ سڑکیں شمالی قفقاز کی سب سے بڑی جائے تعمیر کو صنعت کے مرکزوں، ریلوے لائین اور قزل - یورتا سے بوئناکسک تک جانے والی خاص ریاستی شاہراہ سے ملاتی تھیں۔

نیا قصبہ دبکی فلیٹوں کے اونچے اونچے خوبصورت بلاکوں کی شکل میں جنم لے رہا تھا اور ہر چیز خوش‌وضع اور خوشگوار تھی۔ اتنی زیادہ بلندی پر سال کے دوران بہت زیادہ صاف اور روشن دن البتہ نہیں ہوتے تھے اور میدان مرتفع اکثر کہرے کی لپیٹ میں رہتا تھا۔ منصوبہ بنانے والوں میں سے کسی نے اس چھوٹی سی بات کو ذہن میں نہیں رکھا تھا۔ لیکن ہوا بہت ہی صاف ستھری تھی۔ یہ ایسی ہوا تھی جس کی لوگوں کو کمی محسوس ہوتی ہے، جو پھیپھڑوں کو صاف اور جلد کو اچھے کلچے کی طرح سرخ کر دیتی ہے، یہ ایسی ہوا تھی جو خون کو قوت عطا کرتی ہے، دل کی دھڑکنوں کو پرمسرت بناتی اور لوگوں کو دل و دماغ کی توانائی عطا کرتی ہے...

چاروں طرف جو یہ سب کچھ ہو رہا تھا اس سے بالکل فطری طور پر قدیم چرکیئی کی زندگی بھی متاثر ہو رہی تھی اور قطع نظر اس سے کہ لوگ چاہتے تھے یا نہیں، وہ محسوس کر رہے تھے کہ مسحور اور سراسیمہ کر دینے والی زندگی انہیں چھو رہی ہے۔ قدیم

چرکیئی اب یہاں آنے والے تعمیراتی مزدوروں کے لئے سیرگاہ اور عجیب و غریب جگہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

چرکیئی پن بجلی گھر تعمیراتی پروجیکٹ۔ چرکیئی باندھ۔ چرکیئی کی زندگی۔ چرکیئی کا ذخیرۂ آب۔

"آپ کبھی داغستان گئے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"وہاں آپ نے کیا دیکھا؟"

"چرکیئی۔"

"اچھا تو یہ کیسا ہے؟"

"شاندار!"

"کیا شاندار؟"

"لوگ۔"

"پاپاخائیں پہنے ہوئے؟"

"نہیں، تعمیراتی کارکنوں کے خود پہنے ہوئے۔"

تیسرا باب

جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ اقدار، جن پر لوگوں کا اعتقاد غیرمتزلزل رہا تھا، کانپ اٹھیں، کس طرح دھرتی نے اپنے طور طریقوں کا لوگوں کو احساس دلایا اور کس طرح انہوں نے ایک دوسرے کو یاد کیا۔

ایک سنگین آگاہی

۱۹۷۰ء میں بہار تاخیر سے آئی اور صرف چیکا – سیزل – میئر کوهساروں ھی میں نہیں۔ پہلی جتائی کے دن برف‌باری ہوئی، گھوڑوں کی دوڑ کے مقابلے منسوخ کر دئے گئے، ان کے انتظار میں اکٹھا ہونےوالے افراد زیادہ گرم کپڑے پہننے کے لئے کپکپاتے ہوئے گھروں کو لوٹ گئے اور جشن کے موقعے کے لئے جو کلچے ساتھ لائے تھے انہیں راستے میں کھا لیا۔

اس کے بعد جلدی جلدی سرد بارشیں ہونے لگیں۔ اس موسم نے

گٹھیا کی یاد دلائی خاص طور سے معمر افراد کو۔ مختدر کی تدفین کے بعد اور بھی خاص طور سے، جبکہ ان افراد کو گیلی زمین اور سرد چٹانوں پر بیٹھنا پڑا تھا۔ قدیم قبرستان میں جو چونے کے پتھروں کی بلند موزا پہاڑی کے دامن میں ایک تنگ پٹی پر مشتمل اور صدیوں قبل سے خاندانوں کے الگ الگ قطعات میں منقسم تھا، اب ذرا بھی گنجائش نہیں باقی رہ گئی تھی اور سنگ‌مزار بیزاری کے ساتھ ڈھلان پر لڑھکنے لگے تھے۔

پہاڑوں میں بہار پہلے قبرستان ھی میں آتی ہے۔ یہاں سفید پھولوں والے پودے دوسری کسی بھی جگہ سے قبل اگتے ھیں۔ اسی طرح گھنٹیوں جیسے زرد پھول اور پہلی گھاس بھی یہیں نمودار ہوتی ھے اور یہاں کے درختوں میں پتیاں بھی سب سے پہلے ھی نکلتی ھیں۔ کیوں؟ کون جانے... شاید اس لئے کہ اس جگہ کے سکون کو شاذ و نادر ھی درھم برھم کیا جاتا ہے۔

پھر پہلی مئی آئی، روتی ہوئی نہیں بلکہ مسکراتی ہوئی۔ حرارت اور محبت بکھیرتا ہوا نغموں کا یوم مئی۔ زمانہ قدیم میں کھستانیوں کو یہ پرمسرت تیوھار نہیں میسر تھا۔ ویسے بھی عموماً انہیں جشن مسرت منانے کا بہت ھی کم خیال آتا تھا کیونکہ ان دنوں ھر جھونپڑا ایک قلعہ تھا اور وھاں رہنے والوں کا خاص مقصد دنیا کے مقابلے میں اس کا دفاع کرنا تھا۔ یوم غم بہت سے تھے لیکن یوم مسرت قمری کلنڈر میں نہیں دکھائے جاتے تھے۔

لیکن یہ یوم مئی ایک مخصوص اہمیت کا حامل تھا کیونکہ یہ کھستانیوں کے لئے پچاسواں پرمسرت یوم مئی تھا۔ اس کے مقابلے میں اھرام مصر کی حیثیت ھی کیا ہے؟ پرانا چمڑے کا جیکٹ پہنے ہوئے اس انسان کے مقابلے میں "توتان‌خامون" کی حیثیت ھی کیا ھے جس نے ۱۹۲۰ء میں ایک پہاڑی چوٹی پر اپنے مازر پستول سے آخری گولی چلاتے ہوئے کھستانیوں کو سوویت اقتدار کی فتح کا مژدہ سنایا تھا!

اور کھستانی عورت، گاؤں سوویت کی چیرمین سلطنت کے مقابلے میں نفرتیتی کی حیثیت ھی کیا؟

اھرام اور ابولھول – مردہ فرعونوں کے لئے مردہ پتھر ھیں۔ لیکن چرکیئی باندھ تو زندہ لوگوں کے لئے زندہ قوت ہے! اسے غلام نہیں

بلکه وہ لوگ تعمیر کریں گے جن کا کام آزاد ہے جو مزدور طبقے سے تعاق رکھتے ہیں اور خود اپنے اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے ایک نئی زندگی کے خالق ہیں۔

شاندار دبکی قصبه، تمام تعمیراتی کارکنوں کا یه دھوپ میں نہایا ہوا رنگا رنگ رہائشی مرکز، دمکتا ہوا سا معلوم ہو رہا ہے۔ اور اسی نئی بہار کے زمانے کے جیسے قصبے میں مزدور کہستانی علاقوں میں یوم مئی کا پچاسواں جشن منا رہے ہیں۔ یہاں پہاڑی سبزہ‌زار ہیں اور شاہ بلوط کے گرہوں والے پستہ‌قد لیکن موٹے موٹے درختوں کے جھنڈ۔ جشن منانے کے لئے اس سے اچھی جگه بھلا اور کہاں مل سکتی ہے؟ اور سب سے اہم چیز یہاں کی ہوا ہے، صاف و شفاف دھوپ میں غبار کا ایک ذرہ بھی نظر نہیں آتا۔ ہوا، جس میں بہار کے اولین پھولوں اور گھاسوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ سچ ہی کہا جاتا ہے که دوسری جگہوں کی به‌نسبت یہاں لوگ دس سال زیادہ زندہ رہتے ہیں۔ اور اس علاقے میں نئے آنے والوں کے بچوں کے رخساروں کو تو ذرا دیکھئے! یہاں سینکڑوں نہیں بلکه ہزاروں افراد آ بسے ہیں اور تعمیرات کا سلسله جاری ہے۔ دیکھئے نا کتنے نئے مکانات بلند ہو چکے ہیں... مزدور اپنے خاندانوں کے ساتھ، خوش و خرم اور جوش میں بھرے ہوئے، نئی بہار کے کپڑوں میں ملبوس بچوں کے ساتھ تعمیرات سے متعلق دفاتر کے سامنے سے جہاں ایک پلیٹ‌فارم بنا دیا گیا ہے، جلوس کی شکل میں "ہرا" کے نعرے لگاتے ہوئے، اظہار مسرت کرتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی خواہ وہ دانش‌مند بوڑھے ہوں، خواہ جوشیلے جوان یا بچے - کوئی بھی تصور تک نہیں کر سکتا که ان کے اور ایک غیرمتوقع مصیبت کے درمیان صرف چودہ دنوں کا وقت باقی ہے۔ اس تباہ‌کن دن کو صرف دو ہفتے باقی ہیں جبکه بچوں بوڑھوں سب پر غم و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔

یه واقعه چودہ مئی کی دوپہر کو پیش آیا جبکه ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف تھا، ہر شخص کے سامنے اس کے منصوبے تھے اور اس کی امیدیں۔ ننھے منے بچے کنڈر گارٹنوں میں تھے، ان سے بڑے بچے اسکول میں۔ مزدور سرنگوں اور خندقوں میں اپنی اپنی

جگہوں پر موجود تھے، فولادی ڈھانچے کھڑے کرنے والے عمودی چٹانوں پر اور ڈرائیور اپنے ٹرکوں کے چکوں پر۔

دن روشن تھا اور چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی، صرف آسمان میں دائمی برفوں کی ٹوپیوں جیسے سفید ابر منڈلا رہے تھے۔ لیکن وہ بھی جیسے کسی متوقع بھیانک واقعے کے خدشے سے تیرتے ہوئے اوپر اٹھ گئے۔ فطرت ایسا لگتا تھا که سانس روکے ہوئے تشویش کے ساتھ کچھ سننے میں محو ہے... گھڑیوں نے بارہ بجائے بلکه صحیح وقت بتانے کے لئے یه کہنا چاہئے که جب بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تو زمین کے نیچے سے ایک عجیب، دور سے آتی ہوئی، ایک بھیانک آواز سنائی دی اور زمین حرکت میں آ کر لہریں سی لینے لگی... لیکن اس سے قبل ہی بلیوں نے رونا اور ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا، کتوں نے روتے ہوئے اپنی دمیں سمیٹ لیں۔ گھوڑے رسیاں توڑ کے الگ ہو گئے، اور گائیں چیختی چلاتی قبرستان کو بھاگیں جیسے مردوں سے کہنا چاہتی ہوں که ہماری حفاظت کرو۔ لیکن لوگ صرف اس وقت چونکے جب زمین ہلنے لگی، کھڑکیوں کے شیشے کھڑکھڑائے اور گھروں کی دیواریں ادھر ادھر جھولنے لگیں۔ لمحے بھر تک تو سب پر بےحسی کی سی کیفیت طاری رہی پھر لوگوں کو ہوش آیا اور اس تباہ‌کن آفت کا جو سر پر منڈلا رہی تھی، احساس ہوا۔

خطرے کے سائرنوں کے ذریعے سب کو چوکنا کیا گیا اور کام بند کر کے کسی محفوظ جگه پر پہنچ جانے کی آگاہی دی گئی۔ لیکن محفوظ جگه تھی کہاں، کون بتا سکتا تھا که یه محفوظ جگه ہے؟

پھر ایک لفظ، دلوں کو دہلا دینے والا لفظ چاروں طرف گونج اٹھا:

"زلزله!!!"

یه مہیب مظہر قدرت جبکه زمین ذبح کئے جانے والے بیل کی نسوں کی طرح اچانک اینٹھنے لگتی ہے، اپنے اندر کوئی ایسی چیز رکھتا ہے جو انسانی ارادے کو بےحس بنا دیتی ہے۔ پہلے تو سوچنے اور عمل کرنے کی قوتیں مفلوج اور پھر سماعت اور بصارت کی قوتیں تیز ہو جاتی ہیں۔ آخر میں صرف ایک خواہش باقی رہ جاتی ہے - بھاگو، بھاگو، بھاگ کے کھلے آسمان کے نیچے کہیں بھی نکل جاؤ۔

"زلزله!!!"

دوپہر کو محسوس ہونے والا وہ جھٹکا اچانک اور بعض جگہوں پر تباہ کن ثابت ہوا لیکن اس نے جان بچانے کی آگاہی کا بھی کام کیا تاکہ لوگ اس سے بھی بھیانک آفت کا سامنا کرنے کے لئے تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔

ریڈیو سے اعلان کر کے اور تار بھیج کر، زلزلہ شروع ہونے کے مقام سے سو کلومیٹر کے دائرے میں رہنے والے تمام افراد کو آگاہی دے دی گئی کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ دیں اور جب تک خطرہ ختم ہونے کا اعلان نہ کیا جائے گھروں کے اندر نہ جائیں۔

مقامی ذمےداروں کو بھی ہدایات جاری کر دی گئیں کہ وہ آبادی کو ہر ممکن امداد کی فراہمی کے سلسلے میں تمام ضروری اقدامات کریں۔

تعمیرات سے متعلق تمام کام روک دئے گئے۔ دبکی قصبے اور "دوستی" نام کی بستی میں رہنے والے افراد گھروں سے نکل کے ایسی ہموار زمین پر جا ٹھہرے جہاں سے دور تک دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگوں نے خیمے نصب کر لئے لیکن چرکیئی کے لوگوں نے قدیم قبرستان کا رخ کیا جہاں مویشی جو دھرتی کی سانس کے سلسلے میں زیادہ زودحس ہوتے ہیں، اکٹھا ہو گئے تھے۔ ویسے تو عام حالات میں یہاں مویشیوں کے داخلے پر سخت پابندی تھی لیکن اس وقت کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ لوگ گھبراہٹ اور خوف کی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جو کچھ ہوا تھا اس پر مختصراً تبصرہ کر رہے تھے:

"ہماری پلیٹیں اچانک کھڑکھڑانے لگیں تو میں نے نظریں اٹھائیں اور بجلی کے باب کو ہلتے ہوئے دیکھا۔"

"ارے بھئی، میں تو لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا اور میرا چھوٹا لڑکا فرش پر کھیل رہا تھا۔ اچانک اس نے کہا: ارے اباجان، یہ مجھے ڈھکیل کون رہا ہے؟"

"مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں کہیں نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔"

"میرا ننھا بچہ چیخ مار کے رونے لگا اور میں نے سوچا کہ آخر

اسے ہو کیا گیا ہے؟ پھر کچھ ایسا لگا جیسے دریچے کے شیشے سے بہت ہی تیز ہوا ٹکرا رہی ہو۔"

"غالباً اب اور جھٹکے تو نہ محسوس ہوں گے؟"

... حسریت اپنے دوستوں کے ساتھ گھاس پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک اخبار پر شراب اور کھانے رکھے ہوئے تھے۔

"پہاڑ ایک دوسرے سے نہیں ملتے لیکن انسان انسان سے ملتا ہے۔ پیو بھی یارو! ہو سکتا ہے کہ ہم آخری بار پی رہے ہوں" حسریت نے کہا۔

"ہاں، ایسا لگتا ہے کہ فطرت اس کہاوت کو ٹھکرا رہی ہے اور پہاڑ پہاڑ سے مل رہے ہیں۔"

"اور ہمارے پاس کوئی بھی نہیں جس سے ہم قریب ہو سکیں..." حسریت نے پرمعنی انداز میں کہا۔ "آج کا دن بھی عجب ہے..." اور اس کی منڈلاتی ہوئی نگاہیں سانولی رنگت اور سیاہ آنکھوں والی ایک حسینہ پر جم کے رہ گئیں جو کچھ ہی دور ایک بلند جگہ پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس قومیق* لڑکی کا نام تھا خامس۔ ایکی بولاق کی رہنے والی اور خاراخور کی بیٹی یا بھتیجی تھی۔ خامس ابھی حال ہی میں وہاں آئی تھی اور اس جیسی عورت کو دیکھ کے کسی کہستانی مرد کے ذہن میں اغوا کر لینے کے جرأت مندانہ خیالی منصوبے کروٹیں لینے لگتے لیکن افسوس کی بات تھی کہ زمانے بدل چکے تھے۔

خامس کے جائے تعمیرات پر آنے کے بعد ہی سے لوگ اسے "سیاہ خامس" کہنے لگے تھے، اس لئے نہیں کہ ہاسٹل میں رہنے والی اسی نام کی لڑکیوں عورتوں اور اس میں امتیاز قائم کر سکیں بلکہ اس لئے کہ وہ خاموش، خود کو بہت لئے دئے رہتی اور اپنی باتوں کو راز میں رکھتی تھی۔ اس سے قبل وہ کہاں رہتی اور کیا کرتی تھی، اس کی مسرتیں اور غم کیا تھے ہاسٹل میں یہ سب کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ پہلی نظر میں تو وہ ذرا سخت قسم کی، نرمی و نزاکت سے خالی عورت معلوم ہوتی تھی لیکن بس پہلی ہی نظر میں۔ حقیقتاً وہ بڑی پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ وہ اپنے گلے میں

---

* داغستان میں ایک قومیت کا نام۔ اڈیٹر۔

ایک خوبصورت طلائی زنجیر پہنے ہوئے تھی، اس کے بال اور خمدار بھویں سیاہ اور دانت ہموار اور سفید تھے لیکن اصل کشش اس کی آنکھوں میں تھی جو آدمی کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ بڑی بڑی، کالی کالی آنکھیں جن کے نصف حصے لمبی لمبی پلکوں سے چھپے ہوئے تھے، آنکھیں جو کچھ اداس سی تھیں اور جن میں اس وقت تیرتے ہوئے بادلوں اور شفاف چوٹیوں کی جھلک تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ شاہ بلوط کے درختوں کی طرف چلنے لگی۔ کسی انجانی قوت نے حسریت کو اٹھا کے کھڑا کیا اور کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع دئے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔ کس مقصد کے لئے؟ کیا یہ سوال ایسا ہے جس کا کوئی جواب دے سکے؟ کسی عورت کے دل میں محبت کی چنگاری کب بھڑک اٹھتی ہے؟ کیا کوئی اس کے دل میں جھانک سکتا ہے؟ وہاں صاف موسم نظر آئے گا یا طوفان بادوباراں کا آغاز جو اپنے راستے سے ہر چیز کو اکھاڑ پھینکتا ہے؟

لوگوں نے دوسروں کو یاد کیا

کہا جا سکتا تھا کہ پہاڑ تو کانپ اٹھے لیکن انسان ثابت‌قدم رہے۔ یہ سچ تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس لمحے پیدا ہونے والا خوف جی کو توڑنے اور جسم کو سن کرنے والا تھا۔ استحکام جس کے لوگ عادی تھے عدم‌استحکام میں بدل گیا تھا اور ہر چیز غیریقینی ہو گئی تھی۔ خوف کا یہ احساس غروب آفتاب کے چند گھنٹوں بعد جبکہ گھاٹی میں شدید تاریکی چھا گئی، کچھ اور قوی ہو گیا۔ شام کو ۹ بج کر ۱۲ منٹ پر فطرت کے استعجاب پیدا کرنے والے اسرار نے ایک بار پھر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ کہستانی عوام کی مختلف نسلوں میں سے ہر ایک نے ایسی بلائے ناگہانی نہیں دیکھی تھی اور اب وہ لوگ انتہائی بربسی کے جذبے سے پست ہو کر رہ گئے۔ یہ صرف خوف ہی نہیں تھا بلکہ ایسی شدید غیریقینی کیفیت تھی جس کا شاید ہی کبھی تجربہ ہوا ہو اور جس نے انتہائی کٹر دہریوں تک کے دل میں اس بات کی طرف سے شک پیدا کر دیا کہ کسی مافوق الفطرت شے کا وجود نہیں... یہ دوسرا

جھٹکا اس وقت محسوس کیا گیا جب لوگ انتظار کرتے کرتے تھک چکے تھے، جب بچے اپنی ماؤں کی گودوں میں سو گئے تھے۔ کہستانی لوگ جلدی سونے کے عادی ہوتے ہیں تاکہ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی بیدار ہو جائیں۔ جب عورتیں سرکشی پر اتر آئی تھیں اور یہ کہتے ہوئے گھر جانے پر اصرار کرنے لگی تھیں کہ "جو ہوگا دیکھا جائے گا، بچوں کو اس طرح کھلے میدان میں لئے کوئی کب تک بیٹھا رہے۔" ہاں، اسی وقت زمین کے اندر سے دھمکی‌آمیز آواز بلند ہوئی اور وہ پھر ہلنے لگی۔

زمین متحرک ہو کے لہریں سی لینے لگی۔ زلزلے کے مرکز پر جھٹکے کی قوت ۸ درجے تک پہنچ گئی۔ لوگ تمام غیراہم باتوں کو — حریفوں، لڑائی جھگڑوں، مشکلات اور گپ‌بازیوں — سب کو بھول گئے۔ جن باتوں سے انہیں تلخیوں کا شکار ہونا پڑا تھا وہ اب اس آفت کے سامنے بہت حقیر معلوم ہونے لگی تھیں۔ لوگ اپنے آپ کو یاد کر رہے تھے، دوسروں کو یاد کر رہے تھے، عزیز و اقارب اور دوست احباب کو یاد کر رہے تھے۔

"زلزلہ!"

دبکی قصبے میں فلیٹوں کے بلاکوں کی متعدد منزلہ عمارتیں ڈگمگانے لگیں، ستون ہلنے لگے، کرنیں کانپنے اور لکڑی کی بیرکیں کھڑکھڑانے لگیں۔ فوری امدادی کاموں کے لئے مزدوروں کے ہنگامی گروپ قائم کئے گئے جن میں تمام کمیونسٹ اور کومسومول ممبران اور تمام مرد شریک تھے۔ اسی طرح کے ایک گروپ کی قیادت اجتماعی فارم کی پارٹی کمیٹی کا سکریٹری مصطفے کر رہا تھا۔ اس میں تقریباً پچاس افراد شامل تھے اور انہیں جائے تعمیر پر امدادی کام کرنا تھا۔ اس کے ارکان پوری طرح تیار تھے اور کوئی نیا جھٹکا محسوس ہونے کی صورت میں مصطفے کو انہیں لے کے موقعے پر پہنچ جانا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا یہ لوگ جائیں گے بھی؟.. ہاں سب کے سب، ان میں سے کوئی بھی پس و پیش کرنے والا نہیں تھا۔ سب کے سب؟ ہاں سب کے سب۔ لیکن کیا روزمرہ زندگی میں بھی ان کا طرز عمل ایسا ہی ہوتا ہے؟ یہ بہت مشکل سوال ہے۔ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں جو مکمل طور پر اچھے یا مکمل طور پر برے ہوں۔ انسان اپنی طاقت اور کمزوری دونوں کے ساتھ جانا پہچانا

جاتا ہے۔ کیا ایسے معاملات ہم سب کی نظروں میں نہیں آتے رہتے کہ کوئی انجینیر، سائنس‌داں یا آرٹسٹ ماہر کی حیثیت سے بہت ہی باصلاحیت لیکن آدمی کی حیثیت سے بہت ہی خراب، بالکل نکما ہوتا ہے! وہ اپنی صلاحیت اور کام کے ذریعے امتیازی حیثیت اور شہرت حاصل کر لیتا ہے، اس کے بعد اس شہرت پر گھوڑے کی طرح زین کستا اور مزے سے سواری کرتا ہے۔

"اس طرح کا کوئی شخص بھلا کسی سے محبت بھی کر سکتا ہے؟"

"اس طرح کا آدمی صرف خوشامدی اور چاپلوس افراد سے محبت کرتا ہے جو اس کی شہرت کے بت پر چاپلوسی کے پھولوں کی بارش کرنے کو تیار رہتے ہیں۔"

"اس طرح کے لوگ واقعی موجود ہیں؟"

"ہیں کیوں نہیں۔"

"میں تو ایسے شخص کے ساتھ جنگل میں اخروٹ اکٹھا کرنے کے لئے بھی نہ جاؤں۔"

"بیکار ہی فکر کرتے ہو۔ وہ تمہارے ساتھ جائے گا ہی کب۔"

"کیوں نہ جائے گا؟"

"اس لئے کہ اخروٹ تو لوگ نقرئی کشتی میں رکھ کے خود ہی اس کے پاس لاتے ہیں اور اخروٹ توڑنے کے لئے بےدھار کے نقرئی سروتے بھی ساتھ لاتے ہیں تاکہ خدا نخواستہ اس کا کوئی دانت نہ ٹوٹ جائے۔"

... چرکیئی کے نیک لوگ قبرستان میں اپنے آبا و اجداد کی قبروں کے درمیان کھڑے، بیٹھے یا لیٹے ہوئے ہیں۔ آپ سن رہے ہیں: مکانوں میں شگاف پڑنے کی آوازیں آ رہی ہیں، چھتیں گر رہی ہیں اور وہ دیکھئے ایک دیوار الگ ہو کر دھڑام سے گہری گھاٹی میں گر پڑی۔ ان تمام افراد میں اگر کوئی شخص بظاہر پرسکون نظر آ رہا ہے تو وہ ہے عشورعلی۔ شاید خود اس کا دل بھی ڈوبا جا رہا ہو لیکن وہ ہر ایک سے پرسکون رہ کر صورت‌حال کا مقابلہ کرنے کو کہہ رہا ہے: وہ دفعتاً پھیل جانے والی دہشت کے خطرے سے واقف ہے جو تمام رکاوٹوں کو توڑ کے بےرحمی کے ساتھ اندھا دھند قیامت مچا سکتا ہے۔

"نیک باپو، آخر تم کراہ کیوں رہے ہو؟ ارے اے پاپاخا پہنے

ہوئے آدمی، میں تم ہی سے باتیں کر رہا ہوں! بھلا یہ تم پھدکی کی دم کی طرح کانپ کیوں رہے ہو؟" عشورعلی نے غصے سے بھری لیکن دھیمی پرسکون آواز میں کہا اور سب نے اس کی بات خاموشی سے سنی۔ "ہونہہ، بھلا یہ زلزلہ بھی کوئی ایسی زبردست چیز ہے جس سے دہشت پھیل جائے۔ اس میں ہے ہی کیا؟ زمین تو ہمیشہ ہی حرکت کرتی رہتی ہے صرف ہم اسے محسوس نہیں کرتے۔"

"لیکن معزز عشورعلی، ایسی صورت تو کبھی بھی نہیں پیدا ہوئی تھی" امیرخان نے کہا جو ایک سنگ مزار سے ٹیک لگائے دھیرے دھیرے دعائیں مانگ رہا تھا۔

"بس تمہیں تو دہشت‌زدہ ہونے کے لئے ایک بات مل گئی ہے۔ کچھ بھی واقع نہیں ہوگا سوا اس کے جسے واقع ہونا چاہئے" اس نے امیرخان کو دھیرے سے کہنی ماری۔ "اور تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ تم کس کے سنگ مزار سے ٹیک لگائے ہوئے ہو؟"

"کس کا ہے یہ؟"

"میرے دادا کا۔"

"شاید یہی وجہ ہے کہ آپ اتنی بہادری دکھا رہے ہیں" امیرخان نے کہا۔ "میں اپنے آبا و اجداد کی قبروں کے پاس ہوتا تو مجھ میں بھی جسارت پیدا ہو جاتی۔"

"اچھا میرے پائپ میں ذرا تمباکو تو بھر دو!" عشورعلی نے امیرخان سے کہا۔

"آخر قبرستان میں پائپ یا سگریٹ پینے کا کیا سوال؟" اس نے احتجاج کیا۔

"یہ پابندی تو عام دنوں کے لئے ہے لیکن جب آدمی کے آبا و اجداد کی ہڈیاں اس کے نیچے بےچینی سے کسمسا رہی ہوں تو پی سکتا ہے۔ تم اسے بھر دو!" اس نے پائپ امیرخان کو تھما دیا اور عورتوں کی طرف مڑا جہاں سے رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں... "ارے سنو وہاں بیٹھی ہوئی عورتو، بہت چیخ چلا چکیں، اب یہ سلسلہ بند کر کے ذرا بچوں کی طرف توجہ مبذول کرو۔"

"یہ لیجئے عشورعلی، یہ رہا آپ کا پائپ۔ مگر یہ بتائیے کہ ہم لوگوں پر اس وقت یہ آفت کیوں نازل ہوئی، آخر کیوں؟"

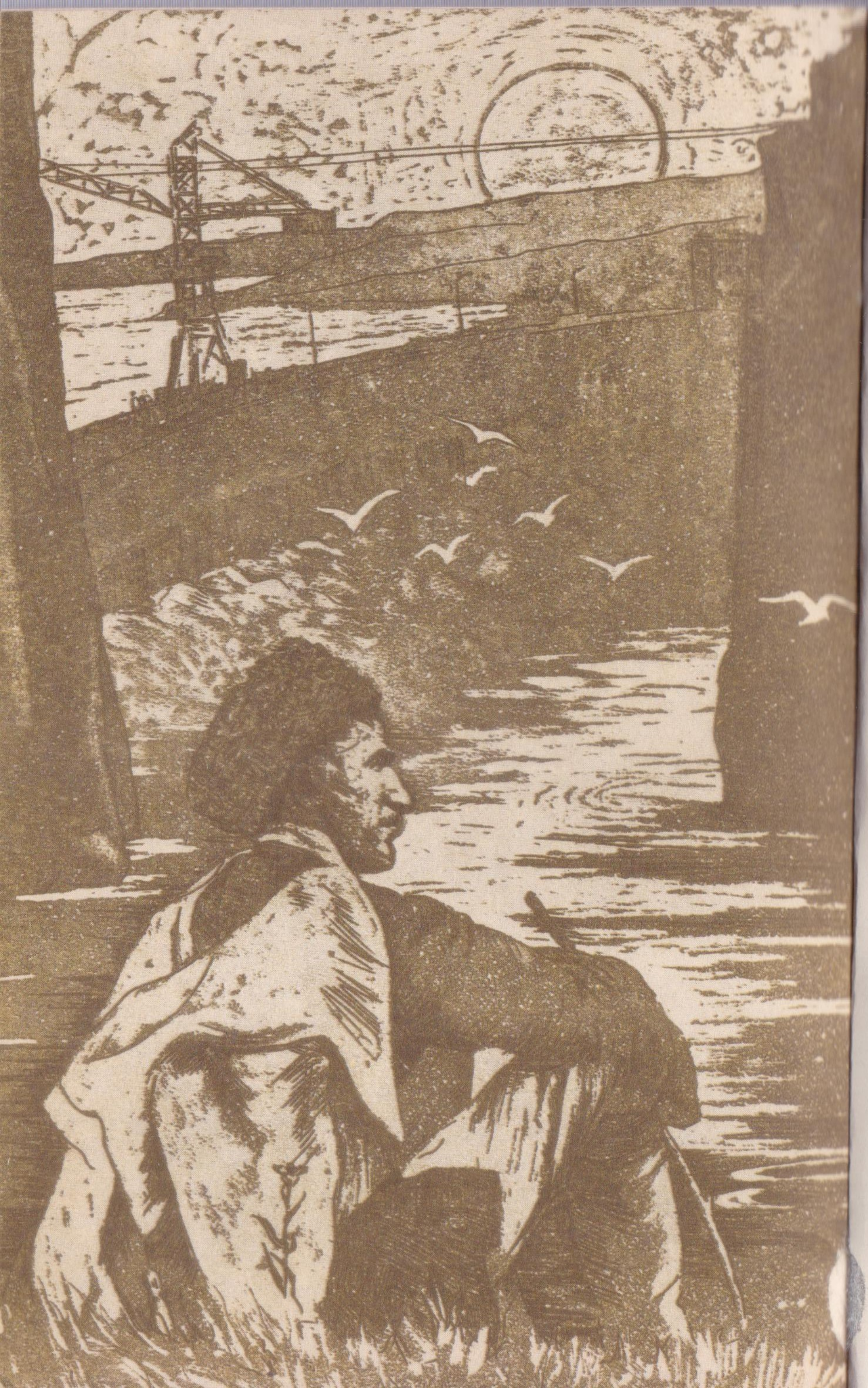

"ارے امیرخان، تمہارا هاتھ کانپ رها هے۔ تمہارے پاس گھونٹے کو هے هی کیا؟"

"لیکن زمین هل رهی هے" امیرخان نے جو مسلسل اپنے ارد گرد دیکھے جا رها تھا، کہا۔

"میں بھی محسوس کر رها هوں" عشورعلی نے پائپ جلا کے بھینی بھینی مہک کا گھرا کش لیا اور غور و فکر جھلکنے والے انداز میں کہا۔ "بھئی انسان کو همیشه اپنے قدموں تلے زمین کو محسوس کرتے رهنا چاهئے۔ لوگ زمین کو بھول گئے هیں، بہت سی خراب باتیں هو رهی هیں اس لئے زمین لوگوں سے خود کو یاد کرا رهی هے۔"

"دیکھو تو وہ مینار جھوم سا رها هے..."

"ارے بھئی، وہ کس کا گھر هے؟ پل بھر میں زمین پر آ رهے گا" یه دنگیر – دنگارچو کی آواز تھی جو ان لوگوں کے قریب آ گیا تھا۔

"میرا هے بھائی، میرا۔ تشویش نه کرو" عشورعلی نے جو گیلی زمین سے اٹھ کھڑا هوا تھا، گھری ٹھنڈی سانس بھرتے هوئے کہا۔ "پرانا هو چکا تھا اور اس کا داهنی طرف کا حصه خاص طور سے کمزور تھا۔ میں نے اس میں بلیاں لگا کے مستحکم کرنے کا کبھی خیال هی نہیں کیا۔"

"ارے عشورعلی، مجھے تمہارے اوپر حیرت هو رهی هے۔"

"وہ کیوں دنگیر – دنگارچو؟"

"تمہارے اس پرسکون رویے کی وجه سے۔ کیا تمہیں اس کی فکر نہیں که هم لوگوں کا کیا حشر هوگا؟"

"فکر کیوں نہیں کر رها هوں؟ لیکن میرا خیال هے که اس آزمائش کے بعد لوگ نسبتاً زیادہ نیک اور بہتر هو جائیں گے... اب ذرا پرسکون هو جاؤ، زلزلے میں زمین هلے گی اور پھر خاموش هو جائے گی۔"

"لیکن خاموش کہاں هو رهی هے۔ زمین تو گڑگڑاهٹ کی آوازوں کے ساتھ برابر لرز رهی هے۔"

"لرز تو دراصل تم رهے هو، زمین نہیں..."

اتنے میں هیڈلائیٹ کی چمکیلی شعاعیں سڑک کے آرپار دوڑ گئیں اور اخروٹ کے درختوں کے جھنڈ کی طرف سے ایک ٹرک قبرستان تک آ گیا۔ سلطنت ڈرائیور کے کیبن سے اور مرد پچھلے حصے سے کود کے نیچے اترے۔ یه پارٹی تنظیم کے سکریٹری مصطفے کے هنگامی

گروپ کے افراد تھے۔ مصطفے ٹرک سے سامان کے بھاری بنڈلوں کو اتروانے میں ان کی مدد کرنے لگا اور سلطنت بمشکل دم سادھے ہوئے لوگوں کے پاس آئی:

"پیارے لوگو، وہاں اس جانب، اخروٹ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک کھلا میدان موجود ہے اور ہم لوگ خیمے اور دریاں چٹائیاں وغیرہ لائے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ خیمے پرانے ہیں لیکن بہرحال استعمال کئے جا سکتے ہیں..."

"ایسے موقعوں پر پرانے خیمے بھی تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے" عشورعلی نے کہا۔

"بہت مشکل، ہر شخص کو ان کی ضرورت ہے اور کافی تعداد میں خیمے موجود نہیں ہیں۔ یہاں سب کی دیکھ بھال کے لئے معزز عشورعلی اور دنگیر - دنگارچو، میں آپ پر بھروسہ کر رہی ہوں۔ آپ دونوں مہربانی کر کے انتظامات کی نگرانی سنبھال لیجئے۔"

"تم فکر نہ کرو، یہ لوگ انتظامات سنبھال لیں گے" مصطفے نے لوگوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں بھی یہیں ٹھہرا رہوں گا۔"

"بہت شکریہ۔ مجھے ابھی اسپتال جانا ہے، وہاں صورت حال گڑبڑ ہے..."

"ارے سلطنت، یہ سلسلہ کیا زیادہ دیر تک جاری رہے گا؟"

"میں کیسے کچھ کہہ سکتی ہوں؟ دیکھئے شاید بارش ہونے والی ہے۔ بہتر ہوگا کہ جلدی جلدی خیمے نصب کر لیجئے۔ الاؤ جلا لیجئے اور کسی بات سے دریغ نہ کیجئے۔ اور ہاں بچوں کا خیال رکھئے" سلطنت بہت زیادہ پریشان تھی کیونکہ ابتدائی جھٹکوں نے جو تباہی پھیلائی تھی اس کی کچھ تفصیلات اسے معلوم ہو چکی تھیں۔ "بھلا کسی نےحسریت کو بھی دیکھا ہے؟" اس نے دھیمے سے پوچھا جیسے بس یوں ہی رواروی میں دریافت کر رہی ہو لیکن اس کی آواز سے تشویش جھلکتی تھی۔

"نہیں، میں نے نہیں دیکھا۔ تم فکر نہ کرو۔ غالباً تعمیراتی کارکنوں کے ساتھ ہوگا" مصطفے نے اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن سلطنت کو عورت کا اندرونی احساس بتا رہا تھا کہ کوئی ناخوشگوار بات واقع ہو گئی ہے اور اس کے رخسار تمتمانے لگے تھے۔

"وہ آ جائیں تو انہیں یہیں روک لیجئے گا۔"

"ہم لوگ سب کچھ دیکھ لیں گے!" اور عشورعلی اظہار ہمدردی کے طور پر مسکرا دیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس عورت کے لئے ساری باتیں اور سارے انتظامات کتنے دشوار ثابت ہو رہے ہیں۔

ٹرک پر سے جیسے ہی سامان اتار لیا گیا، سلطنت روانہ ہو گئی۔ اس نے اسپتال جانے کو کہا تھا لیکن اس کا رخ اسپتال کے بجائے نئے چرکیئی کی طرف تھا۔ زلزلے نے نئے چرکیئی کو بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اب وہاں ایک بھی مکان نہیں کھڑا تھا، سب کچھ منہدم ہو چکا تھا۔ وہ چرکیئی کے لوگوں کو اس کے متعلق ابھی کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ ویسے ہی بےحد پریشان تھے۔

سلطنت کے جاتے ہی بڑے بوڑھوں نے دوسرے مردوں کو اکٹھا کیا اور ان کے ساتھ مل کے کام کرتے ہوئے جیسا کہ سلطنت نے مشورہ دیا تھا، اخروٹ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس خیمے نصب کر دئے – سات بڑے اور دو چھوٹے خیمے۔ سب لوگ ان کے اندر اکٹھا ہو گئے کیونکہ آسمان پر کالے کالے بادل منڈلانے لگے تھے جیسے زمین پر پیش آنے والے واقعات کی گونج آسمان تک پہنچ گئی ہو۔ جلد ہی طوفان آ گیا۔ قیامت کی بارش بادلوں کی گھڑگھڑاہٹ اور بجلی کے کوندے مسلسل لپکتے ہوئے۔ اخروٹ کے ایک درخت پر بجلی گری اور اسے کلہاڑے کی شدید ضرب کی طرح بیچ سے پھاڑ کے رکھ دیا۔

مصیبت میں شانے سے شانہ ملائے ہوئے

بارش جلد ہی رک گئی لیکن لوگ خیموں ہی میں رہے۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے سے ملے ہوئے گٹھری بنے پڑے پڑے سو گئے تھے۔ صرف معمر افراد اور جوان مرد جاگ رہے تھے۔ ان لوگوں نے باہر نکل کے مایوس کر دینے والے مناظر دیکھے: زلزلے نے تباہی میں جو کسر چھوڑی تھی اسے تیز بارش نے پورا کر دیا تھا۔

"وہ دیکھو، وہاں بھی کسی کا گھر بالکل خمیدہ ہو کے رہ گیا

ہے" دنگیر – دنگارچو نے کہا۔ اس کی آنکھوں کی بصارت اب بھی خاصی تیز رہی ہوگی تب ہی تو چند بکھرے ہوئے ستاروں کی روشنی میں اس نے اچھی طرح دیکھ لیا۔ ان دنوں وہ زندہ تھا اور اپنی موت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ امیرخان کی آنکھیں زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ تو گزشتہ نو برسوں سے عینک استعمال کر رہا تھا جس کی بہت عزیز شے کی طرح حفاظت کرتا تھا کیونکہ اس عینک کے لئے اسے ایک مشہور پروفیسر کے پاس اودیسہ جانا پڑا تھا۔

"چاروں طرف تباہی ہی تباہی نظر آتی ہے۔ آخر یہ ہے کیا، دنیا کا خاتمہ ہے کیا؟" اس نے عینک سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"قہرخدا ہے۔ لیکن اس کا سبب کیا ہے؟"

"ہمارے گناہ۔"

"کون سے گناہ؟ گناہوں سے کسی کا دامن پاک نہیں" عشورعلی نے سخت لہجے میں کہا، اچانک اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، ستاروں کی ہلکی نیلی روشنی میں ہر ایک کو گہری نگاہ سے دیکھا، جلدی سے کوٹ اتار کے بغل میں پتھر پر بچھایا اور جوتے اتارنے کے بعد گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

سب خاموش ہو گئے کیونکہ کوئی بھی شخص اس کی عبادت میں مخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ جی ہاں، عشورعلی اکثر کہا کرتا تھا: "تمہارا جو بھی جی چاہے کرو لیکن میں تو اپنے خدا پر اعتقاد رکھتا ہوں، وہ میرے ساتھ ہے!" لوگوں کو اس کے یہ الفاظ اب اس موقعے پر بھی یاد آئے۔ نسبتاً کم عمر والوں نے جنہیں ایک طرح کی الجھن سی ہو رہی تھی، اس بےچین خاموشی کو توڑنے میں پہل کی۔

"بھائیو، ذرا مجھے بتائیے" ایک کھنکتی ہوئی آواز نے کہا۔

"گناہ کو کس طرح سمجھنا چاہئے؟"

"اس کی جیسی بھی چاہو وضاحت کر لو۔"

"ہاں، لیکن صحیح معنوں میں سوچا جائے..."

"گناہ کے مسئلے پر لیکچر دینے کے لئے گاؤں سوویت کا سکریٹری سب سے زیادہ اہل ہے۔"

"بھلا میں کیوں ہوں؟" ابالا عبدالعرشی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لئے کہ تم عہدےداروں سے زیادہ قریب ہو، تم چیزوں کو وسیع‌تر پس منظر میں دیکھ سکتے ہو" کسی شخص نے اس پستہ‌قد نوجوان کو اپنی بانہوں میں جکڑ کے ایک پرانے سیدھے کھڑے سنگ مزار پر بٹھا دیا۔

"ارے، تم لوگ بالکل پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

"ارے بھئی، ٹھیک ہے۔ آج تو تم اس کے اوپر بیٹھ ہی سکتے ہو۔"

"ہاں، تو ذکر گناہ کا ہے۔"

"گناہ..." ابالا عبدالعرشی نے دوھرایا۔ اب اس کے لئے فرار کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی۔ ویسے اس میں قوت تخئیل کی بھی کمی نہ تھی۔ "غور سے دیکھا جائے تو انسان گناہ کا ثمر ہے۔ ہے ایسا کہ نہیں؟"

"بالکل ٹھیک!" ہر طرف سے اس کی تائید کی گئی۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ ایسے سوالات کے سلسلے میں اسے اپنا راستہ صحیح معنوں میں معلوم تھا۔

"تو پھر" ابالا عبدالعرشی نے بہ‌آواز بلند سوچتے ہوئے کہا۔ "تو پھر کسی پھول کے زیرہ چھڑکنے جیسی سیدھی سادی بات بھی گناہ ہوئی۔ صحیح ہے کہ غلط؟"

"صحیح!" نوجوانوں نے جوش میں آ کر اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور مچھلی کا انڈے دینا بھی گناہ ہی ہوا؟"

"اور مصنوعی طریقے سے گابھن کیا جانا تو دوھرا گناہ ہے!"

"لیکن بھائیو، اس طرح ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ حیرت‌انگیز ہی نہیں کچھ اس سے بڑھ کے بھی ہے: قدرت بجائے خود گناہ‌گار ہے، زندگی کا وجود گناہ‌گار ہے، ہر شے گناہ‌گار ہے... تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ گناہ‌گار کون نہیں ہے؟"

اس سوال کی کسی کو بھی توقع نہ تھی۔

"ہاں، تو گناہ‌گار کون نہیں ہے؟ یہ میں آپ سے پوچھتا ہوں! خاکستر؟ انحطاط؟ ہر چیز پانی سے شروع ہوئی تو پانی کو یقیناً گناہ‌گار ہونا چاہئے اور آفتاب کو بھی!"

"آفتاب کو کچھ نہ کہنا!" ایک بےباک چیخ جو تقریباً فریاد جیسی تھی، زمین کے نیچے سے آتی ہوئی معلوم ہوئی اور ابالا

عبدالعرشی چونک کے سنگ مزار سے نیچے آ گرا۔ "آفتاب نے کوئی گناہ نہیں کیا!" یہ عشورعلی کی آواز تھی جو زمین پر جھکا ہوا تھا۔

"ارے دوستو، میری مدد کرو، میری ٹانگ میں موچ آ گئی ہے" عبدالعرشی نے قابل رحم طور پر کراہتے ہوئے کہا۔

"خدا نے تمہیں سزا دی" عشورعلی نے پتھر سے اٹھ کے کھڑے ہوتے ہوئے گرج کر کہا۔ "تم کہتے ہو کہ ہر چیز گناہ‌گار ہے اور ہر چیز منہدم ہو کے برباد ہو جائےگی؟" اس نے اب دھیمے لہجے میں اپنی بات جاری رکھی۔ "تم لوگوں کو اس بات سے تشویش کیوں پیدا ہو؟ تم لوگوں کے لئے تو نیا چرکیٹی تعمیر کیا جا رہا ہے یا ہو سکتا ہے کہ..." اس کی آواز ایک بار پھر چیخ میں بدل گئی۔

"ہمارے لئے؟" بزرگوں نے اظہار حیرت کیا۔ "لیکن صرف ہمارے لئے ہی کیوں؟ تمہارے لئے بھی!"

"نہیں، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں! میں یہیں ٹھہروں‌گا، یہیں! میں اس پتھر کو اپنے لئے تیار کر رہا ہوں۔ میری قبر یہیں بنےگی!"

"تو کیا، تمہارا خیال ہے کہ ہم پر عذاب نازل ہوا ہے؟"

"میرا کچھ بھی خیال نہیں! یہ تو خدا کی مرضی ہے! میں کچھ بھی نہیں سوچتا ہوں!" عشورعلی اپنی بات کی تردید کرتے ہوئے چیخ پڑا۔ "اگر کچھ سوچ رہا ہوں تو صرف بچوں کے بارے میں۔ ہم انہیں کل کھانے کو کیا دیں‌گے؟ غذا ہم کو کہاں سے ملےگی؟"

"گھروں سے۔ اپنے ساتھ کچھ لانے کے لئے ہمیں وقت ہی نہیں مل سکا۔"

"تو پھر آخر تم لوگ یہاں مقدس جگہ کھڑے ہوئے گناہ کے متعلق باتیں کیوں کر رہے ہو؟ یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ خوف اور دہشت نے تمہاری ساری سوجھ بوجھ چھین لی ہے، تم میں شرم اور احترام کا شعور تک باقی نہیں رہ گیا؟ تم لوگ... میں جنگ کے بعد پیدا ہونے والوں سے مخاطب ہوں۔ ہاں، تو تم لوگ آخر ہنس کاہے پر رہے ہو؟ سوچ کاہے کے بارے میں رہے ہو؟ زلزلہ اکیلے نہیں آیا کرتا۔ اس کے بعد دوسری مصیبتیں اور پریشانیاں آتی ہیں، لوگوں کے بارے میں سوچو نا، بچوں کے متعلق، اپنی بہنوں اور ماؤں کے بارے میں سوچو نا" عشورعلی نے غصے سے مکا ہلایا۔ "گاؤں سوویت کی چیرمین

سلطنت عورت ہوتے ہوئے بھی ہماری مدد کرنے کے لئے پریشان ہو رہی ہے، پل بھر بھی چین سے نہیں بیٹھتی جبکہ تم لوگ جو پاپاخائیں پہنے ہوئے ہو..."

"مگر اس وقت جبکہ ہر چیز گر رہی ہے، ہم گھروں کے اندر کیسے جا سکتے ہیں؟"

"یہ بات کس نے کہی؟ امیرخان، تم نے... بھئی، ہم تم سے کسی بات کا مطالبہ نہیں کر سکتے لیکن یہ لوگ!"

"ہمیں معاف کیجئے، عشورعلی، ہم جا رہے ہیں اور اپنے بس بھر سب کچھ کریں گے..." جوان مرد الجھن میں پڑ گئے۔

"دیکھو نا، کس قیامت کی سردی پڑ رہی ہے۔ بچے خیموں میں کپکپا رہے ہیں۔ میرے بھائی دنگیر – دنگارچو، تمہارا کیا خیال ہے؟"

"محترم عشورعلی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو بھی جانا چاہئے کیا؟"

"ہم بھی چلیں گے!"

سترہ سے پینتالیس سال کی عمر کے لوگوں کو جنہیں مصیبت کے موقعے پر سب کا مددگار اور محافظ ہونا چاہئے تھا، سخت الجھن اور ندامت کا احساس ہوا۔ انہیں یہ سوچ کر شرم آئی کہ اس کام کو انجام دینے کا خیال خود ان کے دلوں میں کیوں نہیں آیا تھا جس کے لئے اب انہیں عشورعلی نے للکارا تھا۔ تب ان کی سمجھ میں آیا کہ سلطنت نے عشورعلی پر کیوں بھروسہ کیا تھا۔

قبرستان سے چل کے تقریباً تیس مرد گاؤں کے مختلف گھروں میں داخل ہوئے اور ضرورت کی تمام چیزیں ساتھ لے آئے۔ ان میں غذائی اشیا، قالینوں، دریوں، کمبلوں، نمدے کے جوتوں اور ہر قسم کے برتنوں کے علاوہ دودھ رکھنے کے برتن بھی شامل تھے کیونکہ صبح کو گایوں کو دوہنے کی ضرورت پڑتی۔ مردوں میں اس طرح مستعدی پیدا کرنے کے بعد عشورعلی دنگیر – دنگارچو کے پاس گیا۔

"ہمارے کرنے کا جو کام تھا سو ہم کر چکے۔ اب ان لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دینا چاہئے۔ اچھا تو اب میرے ساتھ ایک مگ شراب پیوگے نا؟"

"یقیناً"

"تو پھر چلو!" عشورعلی نے دنگیر – دنگارچو کا ہاتھ پکڑ لیا اور

سر کی جنبش سے قریب میں موجود بوڑھوں کو بھی مدعو کر لیا۔ اس وقت لوگ سامان کے بنڈل اور گدے تکیے وغیرہ اٹھائے ہوئے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔ "سنو بھئی نڈر جوانو" عشورعلی نے پکار کے ان سے کہا، "ہم لوگ دنگیر – دنگارچو کے گھر میں ہوں گے، ہماری ضرورت پڑے تو وہاں چلے آنا۔"

"بہت اچھی بات ہے بزرگو!"

وہ لوگ دنگیر – دنگارچو کے گھر پہنچے اور مہمانوں کے کمرے میں گدوں پر پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ اس دوران دیواروں پر ٹنگے ہوئے تانبے کے برتن دھیرے سے کھڑکھڑائے۔ اس کا سبب یا تو زلزلے کا کوئی اور جھٹکا رہا ہوگا یا ان لوگوں کے قدموں کی دھمک۔ دنگیر – دنگارچو نے باواآدم کے زمانے کا تیل کا لیمپ جسے کبھی دوکان میں خریدا تھا، روشن کیا۔ پھر تیل چھڑک کے آتش‌دان میں آگ جلائی۔

"اچھا، تو اب یہ بتاؤ کہ ہمارے جسموں کو گرمانے کے لئے تمہارے پاس ہے کیا؟"

"ابھی لایا، عشورعلی بس ابھی" میزبان تیاریوں میں جلدی کرنے لگا۔

"بارش کے بعد سردی نے مجھے تو بالکل ہی بےجان کر دیا۔"

"شراب کے ساتھ ہم لوگ کھائیں گے کیا؟"

"ارے، جو کچھ بھی ہو لے آؤ، دنیا مسمار ہوئی جا رہی ہے اور تم پوچھ رہے ہو کہ شراب کے ساتھ کھائیں گے کیا۔ شراب اچھی گفتگو کے ساتھ پئیں گے..."

بڑے بوڑھے اب ذرا کچھ موڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔

دنگیر – دنگارچو نے اپنا کہستانی کوٹ بیش‌میت اتار دیا۔ گاؤں کا ہر شخص جانتا تھا کہ وہ سینے پر جیبوں والی فوجی طرز کی ٹیونک پہننا بہت پسند کرتا تھا، پھر ایک کشادہ پیٹی جس پر ستارہ بنا ہوا تھا، باندھتا تھا۔ اوپر وہ اپنا پرانا بیش‌میت پہن لیتا تھا تاکہ فوجی کپڑوں سے اس کے گھرے لگاؤ کا غیر ضروری طور پر مظاہرہ نہ ہو سکے۔ ہر سال وہ شہر میں اپنے درزی کے یہاں جا کے اچھے خاکی رنگ کے کپڑے کی ایک ٹیونک کا آرڈر دیا کرتا تھا۔ اس کے کپڑوں کو دیکھ کر دوسرے بوڑھوں کے ذہنوں میں

جنگ کے زمانے کی یادیں تازہ ہو جاتیں۔ ہاں اور خانہ‌جنگی کو کیے کوئی فراموش کر سکا تھا؟ بیش‌میت کے بجائے کمیساروں والی چمڑے کی جیکٹ پہن کے دنگیر – دنگارچو کو بڑی مسرت ہوتی لیکن وہ اسے ملتی کہاں؟.. جیسے جیسے برس گزرتے جا رہے تھے ان لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی جنہوں نے پرانی دنیا پر دھاوا بولا تھا، جنہوں نے ایک زمانے میں ظالموں جابروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس زمانے کے سورماؤں میں سے تو اب بہت ہی کم لوگ باقی بچے تھے۔

دنگیر – دنگارچو نے تام‌چینی کے مگوں میں سب کو شراب پیش کی۔

"تم لوگوں کی اچھی صحت اور اس ساری مصیبت کے اچھے مآل کے لئے!"

"دعا ہے کہ سب کچھ ایسا ہی ہو!"

عشورعلی آتش‌دان میں تیزی کے ساتھ دھک جانے والی آگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ کسی آب رنگ مصور نے اس وقت اس کی تصویر بنانے کے لئے دوسرے رنگوں کا انتخاب کیا ہوتا۔ اس نے پیشانی، ناک، رخسار کی ہڈیوں اور کان کی لوؤں کے لئے انگارے جیسے سرخ رنگ، داڑھی اور مونچھ کے لئے سفید اور گھٹے ہوئے سر کے لئے جس پر کڑے بال نکل رہے تھے خاکستری رنگ استعمال کیا ہوتا۔ تصویر کے پس منظر میں گہرے نیلے رنگ کی دیواریں دکھائی گئی ہوتیں جن پر آتش‌دان کے شعلوں کی پرچھائیاں تھرتھرا رہی تھیں۔

ہاں، اب کہیں جا کے ان لوگوں نے اندازہ لگایا کہ دن کے دوران محسوس کئے جانے والے اس پہلے جھٹکے نے ان لوگوں پر کتنا زیادہ احسان کیا تھا۔ اس نے لوگوں کو آگاہی دے دی تھی، انہیں چوکنا کر کے تیاری کے لئے وقت دے دیا تھا۔ بعد میں بتایا گیا تھا کہ داغستان میں ۱۴ مئی ۱۹۷۰ء کو آنے والے زلزلے کو سوویت یونین کے زلزلے سے متعلق تمام مرکزوں نے ریکارڈ کیا تھا۔ زلزلہ شروع ہونے کی جگہ، جمہوریہ کے دارالخلافہ مخاچ‌قلعہ سے ۳۰ کلومیٹر مغرب جنوب میں واقع تھی۔ اس زلزلے کے وقت اس کے مرکز میں

جو توانائی پیدا ہوئی تھی وہ تاشقند زلزلے کے وقت پیدا ہونے والی توانائی سے سو گنی زیادہ تھی۔

"اس قدرتی آفت سے داغستان کے سولہ علاقوں اور چار شہروں کو جو جمہوریہ کے مجموعی رقبے کے ۲۵ فیصدی حصے پر مشتمل ہیں، شدید نقصانات پہنچے ہیں جہاں جمہوریہ کی نصف سے زائد آبادی میں تقریباً ۴۵ ہزار افراد بےگھر ہو گئے ہیں۔"

ہر گھنٹے تباہی اور بربادی کی نئی اطلاعات اور تفصیلات موصول ہو رہی تھیں۔ ہر زبان پر ایک ہی لفظ تھا: زلزلہ!

افواہیں اڑیں، ان میں اضافہ ہوا اور یہ کہستانی ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے برف کے گولوں کی طرح بڑھتی چلی گئیں۔ چشم‌دید مشاہدین بتاتے تھے کہ پہلے زمین بھنبھنائی پھر بنفشئی روشنی پھیلی اور زمین لرز اٹھی۔ ایکی بولاق جانے والے راستے پر جو دامن کوہ میں واقع تھا، چرواہوں نے زمین کو ہوا میں بل کھاتے ہوئے گیہوں کے پودوں کی طرح لہریں لیتے ہوئے اپنی طرف لپکتے دیکھا تھا۔

چوتھا باب

زبردست قدرتی آفت کی جنم دی ہوئی پہیلیوں جیسی باتوں کے متعلق۔

شکوک سے پیدا ہونے والے خوف

اتنے شدید زلزلے کے باوجود جانے کیوں قدیم گاؤں کے کمزور مکانوں کو جن کی دیواریں گارے سے جڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھروں کی بنی اور موسمی اثرات سے جگہ جگہ بدرنگ ہو گئی تھیں، جن کی بالکونیاں خمیدہ ستونوں پر ٹکی ہوئی تھیں اور جن کی گانٹھ والی بلیوں پر رکی ہوئی ہموار چھتوں کو بارشوں کے بعد ہر چھت پر رکھے رہنے والے پتھر کے رولر سے کوٹ کر مضبوط کیا گیا تھا، بہت کم نقصان پہنچا۔ یہ گھر شہد کے چھتوں کی طرح کھڑی نشیب پر مضبوطی سے رکے رہے اور ان دو منزلہ اور بعض اوقات تین منزلہ رہائش گاہوں کے استحکام پر کوئی خاص اثر نہ پڑا سوا اس کے کہ ان میں کہیں کہیں شگاف پڑ گئے، چند دیواریں ٹیڑھی ہو گئیں اور ایک مینار گر گیا۔

لیکن ذرا نئے قصبے کو تو جائیے۔ کچھ پلوں کو پار کیجئے، کچھ ڈھلوان پہاڑیوں پر چڑھئے اور مستقبل کے ذخیرۂ آب کے کنارے واقع اس مشہور میدان مرتفع تک پہنچئے جہاں نیا چرکیئی تعمیر کیا گیا تھا... اس کی تعمیر ہر لحاظ سے جدید طرز پر ہوئی تھی اور سیمنٹ کے چوکوں والی چھتوں کی پائیدار اور مضبوط عمارتیں کسی ڈھلان پر نہیں بلکہ ہموار زمین پر تعمیر کی گئی تھیں۔ سب کے لئے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ پہاڑ کی بلندی پر دبکی میں فلیٹوں پر مشتمل اونچی اونچی عمارتیں خواہ وہ پتھر کی ہوں یا اینٹ کی یا پہلے سے بنے بنائے ٹکڑوں کو جوڑ کر کھڑی کی گئی ہوں، زلزلے کے جھٹکوں کو برداشت کر لے گئیں (چند جگہوں پر پڑنے والے شگافوں کو ہم کسی شمار میں نہیں لاتے)۔ اسی طرح لکڑی کی بیرکوں اور عارضی رہائش‌گاہوں اور بنیادوں میں جو کچھ تعمیر ہو چکا تھا اس کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچا لیکن نیا چرکیئی جہاں قدیم گاؤں کی آبادی کو منتقل ہونا تھا، تباہ ہو گیا۔ شاید جگہ کا انتخاب کرنے والوں سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تھی، شاید انہوں نے کسی خاص پہلو کو نظرانداز کر دیا تھا۔

بوڑھا عشورعلی اپنے گھر میں، جسے زلزلے سے نقصان پہنچا تھا اور جہاں شگاف پڑا تھا وہاں ایک کمبل لٹکا ہوا تھا، ساری تشویش اور سنسنی کے بعد تھکا ہارا غافل سو رہا تھا اور اس کے ٹیڑھے ہو جانے والے گیٹ پر لوگوں نے گھبراہٹ سے دستک دی تو وہ کچھ نہ سن سکا۔ بوڑھی زازا، پہلی مہیب رات کے بعد خیموں کی بستی سے جسے اب چرکیئی کے باشندے کیمپ کہتے تھے، ابھی تک گاؤں نہیں لوٹی تھی اور وہ اپنے پوتی پوتوں اور بغیر دم والی گائے کے ساتھ خیمے ہی میں مقیم تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ گھر میں نہ ہوں؟" کسی نے کہا۔

"گھر میں ہونا چاہئے، گیٹ اندر سے بند ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں کچھ ہو گیا ہو؟"

ان لوگوں نے گیٹ کو زیادہ زور زور سے کھٹکھٹایا اور اتنا ہلایا کہ وہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ آخرکار عشورعلی جاگ کے سننے لگا: یہ آوازیں کیسی ہیں؟ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے؟ اس نے حالیہ پریشانیوں کے بارے میں سوچا اور سب سے پہلا خیال جو اس

کے دل میں آیا یہ تھا کہ کوئی نئی مصیبت نازل ہو گئی ہے کیا۔ وہ اتنی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا جس سے ایسا کوئی شخص کام لے سکتا ہے جس کا بڑا بیٹا ساٹھ سال کا ہونے کو ہو... وہ بیٹا جس کا نام بولات تھا، اس کی پہلی بیوی سے پیدا ہوا لیکن ماں کے بغیر پروان چڑھا تھا کیونکہ وہ اس کی پیدائش کے وقت انتقال کر گئی تھی۔ عشورعلی کو اس سے شکایت تھی کہ وہ اس سے بہت دور رہتا تھا۔ وہ جہاز کا کپتان اور مشرق بعید میں مقیم تھا۔ رٹائر ہونے کے بعد اس کے گاؤں واپس آ جانے کا امکان تھا۔ بوڑھے نے جلدی جلدی کپڑے پہنتے ہوئے اپنے بیٹوں کو یاد کیا اور اس کے سینے میں امید کی ایک ہلکی سی کرن تھرتھرا اٹھی: کہیں ایسا تو نہیں کہ بیٹوں میں سے کوئی مدد کرنے کے لئے گھر آ گیا ہو؟ شاید دوسرا بیٹا حاجی آ گیا ہو جو ملازمت کے سلسلے میں آرکٹک علاقے میں مامور تھا؟ یا شاید سب سے چھوٹا مراد آ گیا ہو جسے اس کی ماں دیر سے کھلنے والا پھول کہا کرتی تھی۔ وہ دوسرے دونوں بیٹوں کی بہ‌نسبت بہت زیادہ قریب بلکہ یوں کہا جا سکتا تھا کہ پڑوس ہی میں — مخاچ‌قلعہ میں رہتا تھا۔

گیٹ کچھ اور زیادہ زور سے کھٹکھٹایا جانے لگا۔

"آ رہا ہوں" اس نے کہا لیکن کچھ اتنی دھیمی آواز میں جیسے کہ دستک دینے والا بغل ہی میں موجود ہو۔

وہ برآمدے میں آیا لیکن گیٹ کے باہر اسے ان میں سے کوئی بھی نظر نہ آیا جنہیں دیکھنے کو اس کا جی تڑپ رہا تھا: نہ بولات تھا، نہ حاجی، نہ ہی مراد۔ ان کے بجائے اس کی مایوس نگاہوں نے گاؤں والوں کے ایک پرشور مجمعے کو دیکھا جس میں اس کے معزز احباب بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے اسے جلدی باہر آنے کا اشارہ کیا۔

عشورعلی نے برآمدے میں رکھے ہوئے ایک گھڑے سے پانی لے کے منہ ہاتھ دھوئے لیکن اس سے قبل اپنے معمول کے بموجب گدے میں پھٹی ہوئی جگہ سے روئی نکال کے کانوں میں ٹھونس لی۔ پھر اس نے خود کو اس بات پر تیار کرنے کی شعوری کوشش کی کہ جوش و خروش میں بھرے ہوئے یہ لوگ جو بھی خبر لائے ہوں گے اسے وہ ٹھنڈے دل سے سنے گا۔

کسی قسم کی عجلت سے کام لئے بغیر وہ سیڑھیوں سے اترا اور

جا کے گیٹ کھولا۔ لوگ دوڑتے ہوئے، ہاتھوں سے اشارے کرتے، چیخوں سے ایک دوسرے کی آواز دبانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے پاس آ گئے۔

"ذرا ٹھہرو، خاموش ہو جاؤ۔ آخر تم لوگوں نے یہاں آ کے مجھے جگایا کیوں؟" عشورعلی نے روئی کانوں سے نکال کے جیب میں رکھ لی اور ایک بار پھر دریافت کیا: "آخر ہوا کیا؟"

"بھئی، ایسا ہے..." ربادان نے کہنا شروع کیا۔

عشورعلی نے ہاتھ اٹھا کے اسے خاموش کر دیا اور باقی لوگوں سے مخاطب ہوا:

"بوڑھے مرد ٹھہرے رہیں، باقی لوگ اپنی راہ لیں اور عورتو، تم بھی" اس نے کہا لیکن وہاں سے جانے پر کوئی تیار ھی نہیں ہو رہا تھا اس لئے اس نے اپنے دوستوں کو ایک ایک کر کے اندر بلانے کے بعد گیٹ بند کر لیا۔ "یوں بہتر رہےگا... میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ مجھے کوئی حیرت‌انگیز بات بتانا چاہتے ہو۔"

"اس سے زیادہ حیرت‌انگیز بات ڈھونڈے سے بھی نہ ملےگی" امیرخان نے کہنا شروع کیا۔

"خوشی کی بات ہے یا غم کی، کہنا مشکل ہے۔"

"اسے ایک عظیم سانحہ کہنا بہتر ہوگا" چنتارئی نے آخر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ تمہاری پیش‌گوئی درست ثابت ہوئی" لنگڑے عثمان نے عشورعلی کو کچھ اس طرح دیکھتے ہوئے جیسے پہلے کبھی دیکھا ھی نہ ہو، کہا۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان احمقانہ الفاظ کے بغیر مجھے بتا دو کہ آخر ہوا کیا ہے؟ میں نے کوئی پیش‌گوئی نہیں کی تھی۔"

"تم نے کہا نہیں تھا: «وقت آنے پر ہم لوگ دیکھیں گے کہ اس ساری بھاگ دوڑ کا نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے، ہر چیز خدا کے ہاتھ میں ہے»۔ یہ بات کیا تم نے نہیں کہی تھی؟" امیرخان نے دل میں گھر کر لینے والے انداز میں پرانا قصہ چھیڑ دیا۔

"سب کچھ تباہ ہو گیا" ربادان نے سونے کے دانتوں سے بھرے ہوئے منہ سے کہا۔

"سب کچھ؟ کہاں؟" عشورعلی نے اسے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

"سب کچھ جس کا ان لوگوں نے یہاں آغاز کیا تھا" لنگڑے عثمان نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور منہ باندھ کی جائے تعمیر کی طرف کر لیا۔

"یہ نہیں ہو سکتا" عشورعلی تیزی سے نظریں اٹھا کے دوری پر دیکھنے لگا۔ "اور نیا چرکیئی بھی؟"

"نیا چرکیئی بھی۔ کچھ بھی نہیں بچا۔"

"باندھ بھی؟"

"باندھ ابھی کہاں مکمل ہوا تھا لیکن ان لوگوں نے جتنا حصہ بنایا تھا وہ بھی گر گیا۔"

"اور قصبہ؟"

"لوگ وہاں سے بھاگ رہے ہیں" امیرخان نے وہ قصہ دوہرا دیا جو اس نے اس روز کہیں سنا تھا۔

پل بھر تک خیالوں میں کھوئے رہنے کے بعد عشورعلی دھیرے دھیرے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ دوسرے افراد بھی اس توقع میں بیٹھ گئے کہ اب وہ فخریہ انداز میں مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہےگا: "ہاں، میں نے تو کہا تھا، میں نے تو پیش‌گوئی ھی کر دی تھی۔ میں نے تو آگاہی دے دی تھی..." لیکن عشورعلی کا چہرہ سیاہ سا پڑ گیا جو کوئی نیک شگون نہ تھا۔ پھر اس کے چہرے پر خاکستری زردی چھا گئی۔

"ایک عظیم سانحہ" عشورعلی نے گہری ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ اس سے ایسے ردعمل کی کسی کو قطعاً توقع نہ تھی۔ "اور بھلا یہ کیا بات ہوئی معزز دوستو کہ تم اس سانحے پر بغلیں بجا رہے ہو؟ تم سمجھتے ہو کہ تم دوڑے دوڑے مجھے کوئی اچھی خبر سنانے آئے ہو؟" اس کی آواز کچھ زوردار ہوتی جا رہی تھی: "لوگوں پر آفت نازل ہو گئی ہے اور تم لوگ... ذرا سوچو تو آخر یہ کیسی بات ہے؟"

"بھئی عشورعلی، ناراض نہ ہو" چنتارئی نے اسے مناتے ہوئے کہا۔

"تم خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ ہمارا گاؤں یہاں جھیل کی تہہ میں ڈوب کے رہ جائے۔"

"سنو چنتارئی، یہاں میرے پاس آ کے بیٹھو اور ٹھیک سے سمجھ لو کہ میں کسی بھی چیز کا مخالف رہا ہوں لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی کی بدبختی کا خواہاں تھا۔ میں نے تم

لوگوں کو کبھی یہ ہدایت بھی نہیں کی کہ تم دوسروں کا برا چاہو" بوڑھے کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا؛ شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ بہت ممکن ہے چنتارئی اسے خلوص دل سے خوش کرنا چاہتا ہو حالانکہ یہ بات خود اس کے اپنے ضمیر کے خلاف تھی۔ "ہاں میرے دوستو، یہ ایک زبردست مصیبت ہے۔"

عشورعلی کے منہ سے یہ بات سن کے سب لوگ حزن و ملال سے خاموش ہو گئے۔

"وہ لوگ اب ہمیں گاؤں سے منتقل نہیں کر سکتے" امیرخان نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔

"مجھے یہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہئے" عشورعلی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں نے دیکھا نہیں ہے لیکن میرے لئے دیکھنا ضروری ہے۔"

"ہم لوگ بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

"تو پھر ہمیں وقت نہ ضائع کرنا چاہئے۔ ہمیں اس طرف جاتا ہوا کوئی ٹرک مل جائے گا۔"

توہم یقین کامل کے خلاف

"ہمارے لئے اپنے عشورعلی کو سمجھنا دشوار ہو گیا ہے" بوڑھوں نے روانہ ہوتے وقت سوچا۔ "لیکن نہیں، وہ تو ہمیشہ ہی سے اسی مزاج کا تھا۔" ان لوگوں نے ایک ایک کی قطار میں سولاک پر بنے ہوئے پل کو پار کیا اور "دوستی" نامی بستی میں کینٹین کے قریب واقعی انہیں ایک ٹرک مل گیا۔ اس میدان مرتفع تک جہاں نیا چرکیئی قدرت کے تباہ‌کن تشدد کے ہاتھوں کھنڈر بن کے رہ گیا تھا، تمام راستے میں عشورعلی کو متضاد نوعیت کے جذبات پریشان کرتے رہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سب کا آخر مطلب کیا ہے؟ کیا یہ سب خدا کی مرضی سے ہوا ہے؟ کیا وہ واقعی اتنا بےرحم ہو سکتا ہے؟ لیکن عشورعلی نے ان خیالات کو ذہن سے نکال دیا کیونکہ ان کا مطلب افعال الہی پر معترض ہونے کے مرادف تھا۔ پھر بھی کتنے افسوس کی بات تھی کہ اتنی زبردست انسانی محنت ضائع ہو کے رہ گئی! اس کے

ساتھ ہی ساتھ ایک اور خیال بار بار اس کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا۔ وہ اسے بھی ذہن سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی: شاید اب تعمیرات کا سلسلہ ترک کر دیا جائے؟ شاید گاؤں کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، سکون سے رہنے دیا جائے؟

"ہمیں سوگوار ہونا چاہئے میرے بھائیو، کیونکہ یہ مصیبت صرف دو ایک افراد پر نہیں تمام لوگوں پر نازل ہوئی ہے" عشورعلی نے ضبط کے ساتھ اس وقت کہا جب وہ ٹرک پر چلے جا رہے تھے۔ "ان لوگوں کو جو پاپاخائیں پہنتے ہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اس آفت پر مسرور ہوں جس کا پہلے سے تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سائنس‌دانوں اور تعمیرات کے نگراں افراد کی غلطیوں کا نتیجہ ہو جنہوں نے عمارات کے لئے غلط جگہ کا انتخاب کیا۔ سوچو نا کہ اگر وہ جگہ اچھی ہوتی تو ہمارے آبا و اجداد نے تنگ گھاٹی میں گاؤں نہ بسایا ہوتا بلکہ اس کھلے بلند میدان میں مکانات بناتے" عشورعلی نے ہر چیز کو اپنے اطمینان کے مطابق بنا لیا تھا: عوام پر کوئی ذمہ‌داری نہیں عاید ہوتی تھی۔ قصور تو سائنس کا تھا۔ یہ تو سائنس‌داں تھے جنہوں نے غلطی کی تھی اور ان کی غلطی کی اتنی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔

عشورعلی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ لوگ عموماً مبالغے سے کام لینا پسند کرتے ہیں لیکن جب اس نے تباہی کے اصل مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ نیا گاؤں، خود کو سجانے سنوارنے اور اپنے تمام حسن و جمال کے ساتھ فخر سے سر اٹھا کے کھڑے ہونے کا موقع پانے سے قبل ہی دم توڑ چکا تھا۔ عشورعلی کے دل نے ایک بار پھر کہا کہ جب لوگ عقل کی آواز پر کان نہیں دھرتے، جب ان بڑے بوڑھوں کے مشوروں سے نفرت کرتے ہیں جو اپنی عقل کی بنا پر نہ سہی، زندگی کے تجربے کی بنا پر اچھے برے میں تمیز کرنا جانتے ہیں، تو یہی انجام ہوتا ہے۔ اس نے سوچا کہ لوگوں نے گاؤں سوویت کی چیرمین سلطنت کی بات مان لی ہوتی اور یہاں منتقل ہو گئے ہوتے تو آج ان پر کیا بیتی ہوتی؟ بہت سے لوگ زخمی ہو گئے ہوتے، شاید مر بھی گئے ہوتے۔ اب یہ لوگ خود کو علم‌غیب رکھنے والا اور اسے، عشورعلی کو غیب‌داں تصور

گرتے ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ خود وہ کبھی بھی ایسے تلخ انجام کا خواہاں نہ تھا...

"اور ہمارا پرانا گاؤں، عہد حاضر کے گھٹیا معماروں کے خلاف خاموش ملامت کے طور پر کھڑا ہوا ہے" یہ بات آسیت کے باپ چنتارئی نے یہ یقین کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہی کہ اس کا داماد تو کہیں قریب میں موجود نہیں کیونکہ ان دونوں کے درمیان اکثر سخت‌کلامی تک کی نوبت آ جاتی تھی۔ دراصل چنتارئی اپنے داماد مصطفےٰ کو ناقابل برداشت تصور کرتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا کہ ایسے شخص کے ساتھ بیٹی بیاہ دی۔

"ہمارے آبا و اجداد نے کتابیں پڑھنا کبھی بھی نہیں سیکھا تھا اس کے باوجود وہ بہت کچھ جانتے تھے..."

"عشورعلی برابر کہتے تھے کہ ہمارے اجداد کو غصہ آ جائےگا۔ یہ بات سچ نکلی۔ کتنا زبردست ہے ان کا غصہ!" امیرخان اور لنگڑے عثمان کی یہ چاپلوسی جانے کیسے عشورعلی کے دل میں سما کے کسی جھیل پر آفتاب کی شعاعوں کی طرح رقص کرنے لگی۔ یہ ایک عجیب بات تھی کیونکہ اس سے قبل وہ چاپلوسی اور خوشامد کرنے والوں کو جھڑک دیا کرتا اور کسی شخص کے منہ پر اس کی تعریف کئے جانے کو قابل نفرت سمجھتا تھا لیکن اب...

"ہمارے آبا و اجداد کی یاد مقدس ہے!" اس نے معنی‌خیز انداز میں کہا۔

چند افراد کھنڈروں میں گھومتے پھرتے ہوئے مختلف چیزوں کو دیکھ دیکھ کر اختصار سے جلدی جلدی کچھ لکھتے جاتے تھے۔ ان افراد میں بڑے بوڑھوں کو سلطنت بھی نظر آئی جو خلاف معمول سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی یہاں تک کہ سر پر بندھا ہوا رومال بھی سیاہ تھا۔

"غم اپنے آپ کو بھڑکیلے شوخ کپڑوں سے نہیں ڈھک سکتا" بوڑھوں نے اس کے سیاہ لباس پر اظہار پسندیدگی کیا۔ "ہماری سلطنت نے ٹھیک ہی کیا ہے۔"

لیکن ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی سلطنت کتنے زیادہ غموں سے چور ہوئی جا رہی تھی۔ گزشتہ روز اس نے شاہ‌بلوط کے درختوں کے جھنڈ میں حسریت کو نشے میں دھت اور

ہوش و حواس کھوئے ایک بالکل جوان سانولی عورت کے زانو پر جس کے کالے کالے بال کھلے ہوئے تھے، سر رکھے کچھ ایسے پرسکون انداز سے سوتے پایا تھا جیسے اس گناہ‌گار زمین پر نہ کوئی تشویش کی بات تھی نہ اتھل پتھل۔

ہاں، وہ خامس ہی تھی۔ وہی بڑی بڑی اداس آنکھوں والی عورت۔ خوف اور دہشت کے لمحات میں اس نے حسریت کو اپنے پاس سے بھگا نہیں دیا بلکہ اس کی ذات میں اس نے اپنے پوشیدہ غموں کا مداوا تلاش کر لیا تھا۔ اس افراتفری میں، اس دہشت کے وقت جو ہر ایک پر طاری ہو گئی تھی، وہ حسریت کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی تھی۔ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر چل دی تھی اور بس ایک نگاہ سے اسے اپنے پیچھے بلا لیا تھا۔ اس نے حسریت کو الفاظ استعمال کئے بغیر پکارا تھا، اسے اپنی جسمانی خواہش سے پکارا تھا اور یہ وہ زبان ہے جسے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مشترکہ تباہی‌وبربادی کے وقت اس نے اپنی تسلی کی صورت نکال لی اور کچھ ایسا محسوس کرنے لگی جیسے یہ خود اس کا اپنا زبردست غم تھا جو دھرتی پر پھٹ پڑا اور سب کے لئے مصیبت کا باعث بن گیا تھا۔

"اچھا ہی ہے کہ یہ سب چکناچور ہو جائے!" یہ اس کی ذات کے اندر ابلتے ہوئے غصے کی، کلیجے پر لگنے والے زخم کے شدید احساس کی آواز اور ایک ایسے دل کی پکار تھی جس کی توہین کی گئی تھی اور جو اپنے غم و آلام سے فرار کی راہ تلاش کر رہا تھا۔ یہ دل انتقام لینا چاہتا تھا اور وہ انتقام خود اس کے اوپر قہر ڈھا رہا تھا۔

سلطنت اپنے حسریت کو بہت دیر تک تلاش کرتی رہی تھی اور اب جو اسے پایا تھا تو اس حال میں جس میں اسے دیکھنے کی زندگی میں کبھی بھی خواہش نہیں کر سکتی تھی... اس سے تو اچھا تھا کہ وہ مر گیا ہوتا، اس سے تو اچھا تھا کہ کوئی چاقو دستے تک اس کے سینے میں اتر گیا ہوتا... سلطنت نے ان دونوں کو دیکھا، عورت پر پہلے نگاہ پڑی جو اپنی کامرانی پر مسرور اور زہریلی ناگن کی طرح خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ وہ پیار سے اس کے سر کو جو اس کے زانو پر رکھا ہوا تھا، سہلا رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں برہنہ

تھیں۔ مضبوط، دھوپ سے سنولائی ہوئی ٹانگیں۔ لباس کا اگلا حصہ کھلا ہوا تھا جس سے دھوپ سے سنولائی ہوئی چھاتیاں نظر آ رہی تھیں۔ اور وہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی، بچے کے اوپر جھکی ہوئی ماں کی طرح جو کسی غیر آدمی کی ناشائستہ نگاہ کی پروا نہیں کرتی۔ کھلے ہوئے بال آنکھوں پر لڑھک آئے تھے۔ سلطنت نے یہ سب دیکھا تو اس کے وقار کو سخت ٹھیس لگی اور اس نے دانتوں سے اپنے ہاتھ میں کاٹ لیا، وہ مایوسی کے بگولے میں پھنس کر زمین پر گر پڑی اور رینگتی ہوئی اس جگہ سے دور ہونے لگی... کافی دیر تک یوں ہی رینگتی ہوئی چلتی رہی حالانکہ پہلے کبھی اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگنا اتنا آسان ہوتا ہے۔ وہ دوڑتی رہی، رینگتی رہی جس سے ہاتھوں پیروں میں خراشیں آ گئیں۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ وہ وہاں سے دور، بہت دور نکل جائے!

زلزلہ آ گیا تھا! اس کے اطراف میں ہر چیز گر گئی تھی، ٹوٹ گئی تھی!

... اب سلطنت اور اس کے ساتھ چلنے والے افراد اس جگہ پہنچنے کو تھے جہاں بوڑھے مرد اپنی چھڑیوں کا سہارا لئے کھڑے ہوئے تھے۔ سلطنت کی آنکھوں میں غم اور مایوسی کے آنسو منڈلا رہے تھے، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور چہرے پر بمشکل ضبط کئے جا سکنے والے درد و غم کی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں۔ اس سے قبل کسی نے اسے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سلطنت کمیشن کے ارکان کو چھوڑ کر گاؤں والوں کے پاس پہنچی اور اپنے معمول کے مطابق عشورعلی سے مخاطب ہوئی:

"کتنی بھیانک بات ہوئی بابا..." اس کی آواز جواب دے گئی اور اس نے اپنا چہرہ عشورعلی کے سینے میں چھپا لیا۔ بوڑھے نے اپنا محبت بھرا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

"ہاں بیٹی، نہایت ہی بھیانک بات، بہت ہی خوفناک بدبختی" اس نے کہا اور سلطنت نے اس کے الفاظ پر چونکتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جیسے اس کی آنکھوں میں اپنے حق بجانب ہونے کی تائید تلاش کر رہی ہو۔ اسے خیال آیا کہ کہیں عشورعلی نے اس کے شدید اندرونی درد و غم کا اندازہ تو نہیں لگا لیا؟

"تو یہ ہوا انجام، گاؤں سوویت کی چیرمین۔ تم نے ہماری باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی... کہو، اب یہ کیسا لگ رہا ہے؟" اسے ایک آواز سنائی دی جیسے کہ خواب میں۔

"اور ہم لوگ تمہارے پیچھے احمق بھیڑوں کی طرح چل پڑے ہوتے، یہاں منتقل ہو گئے ہوتے تو کیا ہوا ہوتا؟.."

"ارے اے، ذرا اپنی زبان کو قابو میں رکھو" عشورعلی نے ڈانٹا۔

"واقعی تم لوگ احمق بھیڑ ہو۔"

سلطنت چونک کے پیچھے ہٹی جیسے کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو پھر اس نے مڑ کے بڑے بوڑھوں کو دیکھا۔ آنکھوں میں آنسو منڈلانے کے باعث اسے ہر ایک کے دو دو چہرے نظر آئے۔

"یہ آخر قصہ کیا ہے؟ آپ لوگ ہماری پریشانیوں کا مذاق اڑانے یہاں آئے ہیں کیا؟"

"سلطنت، تم اس بات کو کوئی اہمیت نہ دو۔ ان لوگوں کو یقیناً ہمدردی ہے" عشورعلی نے معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

"کون؟ یہ لوگ؟ جی نہیں! لعنت ہو اس شخص پر جو خباثت لے کے آتا اور بغلیں بجاتا ہے، لعنت ہو اس شخص پر جو آج ہمارے غم سے متاثروملول نہ ہو۔ آخر آپ لوگوں کی ہمت کیسے پڑی؟ مجھے آپ پر شرم آ رہی ہے، شرم..." اور سلطنت سسکیاں بھرنے لگی۔

"ہمارا پرانا گاؤں ابھی تک قائم ہے، ہمارے گھر کھڑے ہوئے ہیں لیکن جدید زمانے میں لوگوں نے آخر اس طرح کی کمزور عمارتیں کیسے بنا دیں؟ اور گاؤں سوویت کی چیرمین، تمہارے ضدی پن اور غصے کا مظاہرہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"آپ کے گھر کھڑے ہوئے ہیں؟ ان میں جو شگاف پڑ گئے ہیں، جو دیواریں گر گئی ہیں ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے اور آپ کے مینار کا کیا حال ہے؟ کیا وہ بھی کھڑا ہوا ہے؟" سلطنت نے رومال کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے سختی سے جواب دیا۔

"تمہارا نیا چرکیئی اب صرف کھنڈر ہی کھنڈر ہے! کوئی شخص اندھا ہو تب ہی اسے یہ بات نہ دکھائی دے گی۔ میں نہیں

سمجھتا کہ اس واقعے کے بعد تم از سر نو غور وخوض نہ کروگی" امیرخان نے کہا۔

"آپ کو بڑی خوشی ہوئی ہے نا! آخر آپ کی ہمت کیسے پڑ رہی ہے! یہ قصبہ ضرور منہدم ہو گیا ہے لیکن ہم لوگ دوسرے قصبے کی، نئے قصبے کی تعمیر کریں گے! آپ میری بات سن رہے ہیں نا۔ ہم اسے تعمیر کریں گے، کھنڈروں کو، ملبے کو صاف کریں گے اور نئی عمارتیں تعمیر کریں گے!" سلطنت کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور شاندار ہو گیا تھا۔

"یہاں کچھ بھی نہ ہوگا!" امیرخان نے تردید کی۔

"ہوگا!"

"یہاں کچھ بھی نہ ہوگا کیونکہ میں نے خود سنا ہے کہ اس جگہ کا انتخاب کر کے سائنس‌دانوں نے غلطی کی تھی!"

"یہاں سب کچھ ہوگا۔ آپ اپنی بری خواہشات کے ساتھ سوچنے میں عجلت نہ کیجئے! یہاں ایک باندھ بنے گا، ایک بجلی گھر قائم ہوگا اور ایک جھیل ہوگی۔ آفتاب "عقاب نشیمن" میں اپنا نور بکھیرے گا۔ آفتاب! میرے الفاظ یاد رکھئے گا، بڑے بوڑھے لوگو!"

"ہم انتظار کریں اور دیکھیں گے۔"

"میرے الفاظ یاد رکھئے، یہاں ایک نئی زندگی موجزن ہوگی! نئی، نئی!" سلطنت نے جوش کے ساتھ کہا۔

اور وہ آن بان والی عورت ان پرعزم الفاظ کے ذریعے اس تمام غصے کا جو اس کے اندر عرصے سے ابل رہا تھا، اظہار کر کے اپنے ایک ایک لفظ میں یقین کرتی ہوئی اپنے صداقت پر ہونے کا احساس لئے ہوئے، تیزی سے چلتی ہوئی کمیشن کے ارکان کے پاس لوٹ گئی جو نقصانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ غالباً ان لوگوں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ لوگ کون تھے اور ان سے کیا باتیں ہوئیں کیونکہ ان سب نے مڑ کے بوڑھوں کی طرف دیکھا۔ عشورعلی اس بات کو سمجھ گیا اور اسے عجب الجھن سی محسوس ہوئی۔ بہرحال لوگ اب بھی اس کے کہنے پر عمل کرتے تھے اور اس نے غصے سے غراتے ہوئے کہا:

"اب یہاں سے چلو! زبان خیالات کے آگے آگے دوڑنے لگتی ہے تو نتیجہ برا ہی ہوتا ہے۔"

مزید پریشانی

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ دریا غائب ہو گیا ہے! جی ہاں، وہی دریا جس کے آر پار ان لوگوں نے باندھ کی تعمیر کا آغاز کیا تھا۔ اور یہ خبر، بدحواس کر دینے والی یہ خبر تاروں کے ذریعے فوری طور پر مرکز کو پہنچائی گئی۔

"دریا غائب ہو گیا!"

"کون سا دریا؟"

"ارے بھائی، سولاک غائب ہو گیا۔ سولاک، سمجھے کہ نہیں؟"

"مگر یہ گیا کہاں؟"

"بھئی، دریا کوئی گائے یا بچھڑا تو ہے نہیں کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہوگا۔ تلاش کیجئے۔ کہیں نہ کہیں ہوگا ہی۔"

"بےوقوف بنا رہے ہو کیا؟ بھلا دریا کیسے غائب ہو سکتا ہے اور پھر دریا بھی سولاک جیسا! ایسا زوردار دریا غائب نہیں ہو سکتا۔ تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"تو تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے نا؟" مصطفی نے غصے سے کہا۔ "میں صاف لفظوں میں بتا رہا ہوں: دریا باقی نہیں رہا۔ سولاک نہیں ہے!" پارٹی تنظیم کا سکریٹری ریسیور رکھ کے تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور حیرانی سے شانے اچکائے۔ "ہونہہ، اس بات کو ان لوگوں پر ثابت کرنے کی کوشش کرنا کوئی ایسی ویسی بات ہے!"

"آپ فکر نہ کیجئے۔ تعمیراتی کارکن بھی ٹیلی‌فون کریں گے۔ ان لوگوں کو یقین کرنا ہی پڑے گا!" سلطنت نے کہا۔

"ہاں، یہ تو ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن ہم کو بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا اور تیزی کے ساتھ۔ میں کچھ لوگوں کو دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت روانہ کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں کچھ پتہ لگ سکے۔ ظاہر ہے دریا ہوا میں تو غائب ہونے سے رہا۔"

"یہ بڑی خطرناک بات ہے" سلطنت نے آگاہی دی، "کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جگہ چھپ کے موقعے کا منتظر ہو؟ دریا بڑا مکار اور بےرحم ہے، کچھ بھی کر سکتا ہے... شرمناک..." اس کے خیالات بھٹک کے کھلے بالوں والی عورت کی طرف مبذول ہو گئے تھے۔

"ارے، یہ تم کاھے کے بارے میں کہہ رہی ہو؟" مصطفے حیران رہ گیا۔

"دریا اور کاھے کے بارے میں" سلطنت نے گھبراہٹ میں جواب دیا۔ "میں پھر ٹیلیفون کرنے کی کوشش کروں گی۔"

پارٹی تنظیم کا سکریٹری دروازے کی طرف بڑھا اور سلطنت نے میز کے پاس جا کے ریسیور اٹھایا۔

"ہلو! ہلو!"

اس بات پر بڑی مشکل ہی سے یقین کیا جا سکتا تھا۔ آخر کوئی دریا، سارے کا سارا دریا، جو تمام نقشوں میں دکھایا گیا تھا جو کوئی معمولی چشمہ نہیں بلکہ ایسا دریا تھا جو چکی کے پتھروں کو نہیں بلکہ ۲۵۰ ہزار کلوواٹ کی صلاحیت والی زبردست ٹربائنوں کو حرکت میں لانے جا رہا تھا، کس طرح غائب ہو سکتا تھا! پھر بھی یہ ایک حقیقت تھی کہ ایسا ہی ایک دریا غائب ہو گیا تھا!

"ہلو! شہر سے ذرا ملائیے تو! میں کہہ رہی ہوں شہر سے!" سلطنت نے ریسیور میں چیختے ہوئے کہا۔ "مرکزی دفتر! انگیج؟ کیا مرکزی دفتر میں صرف ایک ہی ٹیلیفون ہے؟" اس نے جھلاہٹ میں زور سے ریسیور رکھ دیا اور آنکھیں اٹھائیں تو دروازے میں کھڑی ایک سانولی، طویل قامت عورت کی نظروں سے جو اس کے اوپر جمی ہوئی تھیں، نظریں چار ہوئیں۔ کتنی بڑی تھیں اس کی آنکھیں اور کتنی اداس اداس! ہونٹوں کے ایک گوشے سے خفیف سی مسکراہٹ جھلکتی تھی۔ اس کے باوجود اس کے اندر جانے ایسی کیا بات تھی جو ایک طرح کا منحوس جادو سا کئے جا رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال دھوئیں کی طرح شانوں تک لٹکے ہوئے تھے جن سے وہ کسی جپسی عورت جیسی معلوم ہوتی تھی۔ سلطنت کو لگا کہ وہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہے۔ پھر اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ کہیں یہ وہی تو نہیں ہے؟!

سیاہ خامس... لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک ایکٹرس کی بیٹی تھی، اس مشہور اداکارہ کی جس پر لوگوں نے کونوں سے گولی چلائی تھی، توہین کی تھی، پتھراؤ کیا تھا۔ یہ صورت‌حال تیسرے دہے میں پیدا ہوئی تھی لیکن وہ تھیٹر چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئی تھی، تمام مخالفتوں کے باوجود اپنے راستے پر گامزن رہی تھی اور

آخرکار ان لوگوں کی جہالت اور تنگ‌نظری کی کمر توڑ دینے میں کامیاب ہو گئی تھی جو چاہتے کہ وہ ذلیل‌ورسوا ہو یا ہلاک کر دی جائے۔ اب لوگ اس کے فن کی پرتپاک تالیوں کے ذریعے داد دینے لگے تھے، اس کے لئے گلدستے لاتے اور اس کے آٹوگراف حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وقت کتنا بدل گیا تھا۔ تو کیا، یہ گمنام عورت اسی اداکارہ کی بیٹی ہو سکتی تھی؟ نہیں، یہ بات تو کسی نے بس یونہی سوچ لی تھی۔

"تو لوگوں نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ سچ ہی تھا" عورت نے اپنی جگہ سے جنبش کئے بغیر کہا۔ وہ اپنے ایک ایک لفظ پر کچھ اس طرح زور دے رہی تھی جیسے کیلیں گاڑ رہی ہو۔

"کیا بتایا تھا تمہیں لوگوں نے؟" سلطنت نے جلدی سے پوچھا۔

"یہی کہ حسریت کے ایک خوبصورت بیوی ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے لیکن میں رشک نہیں کر رہی ہوں..."

"تم رشک کرتی ہو کہ نہیں، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں!" یہ سلطنت کی آواز تھی، پروقار اور پرعزم۔ اب اسے ذرا بھی شک نہیں رہ گیا کہ وہ خامس ہی تھی۔ "آخر تمہیں چاہئے کیا؟" وہ رنگین پنسلوں سے کھیلنے لگی۔ بےچینی اور پریشانی کے وقت وہ عادتاً پنسلوں سے کھیلنے یا کاغذ کی کلپوں کو تار میں پرونے لگتی تھی۔

"وہ کہاں ہے؟" خامس نے دھیرے سے پوچھا۔

"کون؟" سلطنت جیسے ہوش میں آ گئی۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری مراد کس سے ہے لیکن اگر یہ سوچتی ہو کہ میں اس کے پیچھے دیوانی ہو گئی ہوں تو غلطی پر ہو۔ بہرحال پیاس بجھانے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔"

سلطنت نے سوچا کہ آخر یہ عورت کاھے کے بارے میں بات کر رہی ہے۔ کون سا راستہ، کون سی پیاس؟ آخر یہ چاہتی کیا ہے؟ اسے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی لیکن وہ خاموش رہی؛ دوسری عورت البتہ باتیں کئے جا رہی تھی اور اس کے الفاظ کہیں دور سے آتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

"مجھے کل تک یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس کے بیوی بھی ہے۔ وہ تمہارے لائق نہیں..."

"یہاں سے چلی جاؤ، مہربانی کر کے جاؤ! میں تمہاری منت کرتی ہوں، مجھے اکیلا چھوڑ دو!" پنسل اس کے ہاتھ سے گر کے میز کے سرے پر لڑھک گئی۔

"اپنے اوپر ہیجانی کیفیت نہ طاری ہونے دیجئے" خامس نے طنزیہ انداز میں "آپ" کہہ کر مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "ذرا خود کو سنبھالئے، تھوڑا سا پانی پی کے پرسکون ہو جائیے۔" پل بھر تک ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی دور سے آتی ہوئی آواز کو سن رہی ہو۔ "اچھی بات ہے، میں چلی جاؤں گی لیکن اسے تلاش تو کر ہی لوں گی۔"

سلطنت کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا جیسے ان پر کسی جنگلی طائر کی پرچھائیں پڑ گئی ہو۔

"مجھے اس کی ضرورت ہے" اس نفرت بھری آواز نے اپنی بات جاری رکھی۔ "صرف آج کے لئے، صرف اس وقت کے لئے۔ کیا وہ گھر میں ہے؟ نشے میں دھت ہے؟ اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ مجھے اسی حالت میں تو اس کی ضرورت ہے اور اس کے ایک بار میرے جسم کی شیرینی سے لطف‌اندوز ہونے کے بعد دنیا کی کوئی چیز اسے میرے ساتھ جانے سے روک نہیں سکتی۔"

"چپ ہو جاؤ، میں تم سے کہتی ہوں، التجا کرتی ہوں..." سلطنت نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس کی اتنی زیادہ توہین کی جا سکتی ہے، اسے اتنا زیادہ ذلیل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ اس عورت سے منت سماجت کر کے اسے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرے مگر دوسرے ہی لمحے اس خیال کو ترک کر دیا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس پر وہ کبھی بھی خود کو آمادہ نہیں کر سکتی تھی!

"اچھا تو الوداع!" سیاہ خامس نے کہا اور اس کے چہرے پر بالکل ہی مختلف کیفیت طاری ہو گئی۔ اب اس کی انکھوں میں درد و کرب کی جھلک نمایاں ہو گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ اتنا زیادہ عزم بھی موجزن تھا کہ سلطنت اسے گزرنے کا راستہ دینے

کے لئے غیرارادی طور پر الگ ہٹ گئی لیکن دھلیز پر پہنچ کے مڑتے ہوئے اس نے اچانک قابل رحم مایوسی کے ساتھ کہا: "مجھے معاف کر دیجئے" اس کی آواز تبدیل ہو گئی تھی۔ اب اس میں غم تھا اور گہرا تاسف۔

لاپتہ دریا

سلطنت، وہ طاقتور اور پراعتماد عورت شیشے کی طرح ٹوٹ گئی۔ اس کے پامال کئے ہوئے دل سے مایوسی کی ایک چیخ باہر نکلنے کو تڑپ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب آخر وہ کیا کرے؟ بال نوچ ڈالے، رونا چیخنا شروع کر دے؟ کسی کو مدد کے لئے آواز دے؟ آخر کیا کرے؟

اس کا ذہن کچھ عجیب الجھن میں پڑ گیا، خیالات مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوئی مکھیوں کی طرح کسمسا رہے تھے اور پل بھر کے لئے ایسا لگا جیسے بےہوش ہو گئی ہو۔ ہوش آیا تو اس نے خود کو غصے سے ہانپتے ہوئے پایا اور دوڑتی ہوئی باہر نکلی۔ سیڑھیوں پر عبدالعرشی سے ٹکرائی جس کے ہاتھ کی فائیل زمین پر گر گئی اور کاغذات احاطے میں بکھر گئے۔ بدحواسی کے عالم میں سلطنت گلی میں دوڑتی ہوئی اپنے گھر پہنچی اور گیٹ پر اس نے اپنے شوہر کو اس عورت کے ساتھ دیکھا...

حسریت اور خامس نے پل بھر کو رک کے سلطنت کو ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔

"یہ تم ہو؟" حسریت نے بیوی سے پوچھا۔ "کیا ہو گیا ہے؟ تم تو بڑی بدحواس سی نظر آ رہی ہو۔"

سلطنت کی ٹانگیں خمیدہ سی ہو گئیں اور اس نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے شوہر کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا جس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے اور جو پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ خامس نے آگے بڑھنے میں پہل کی۔ مڑ کے پیچھے دیکھے بغیر وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی، اپنے اوپر پورے اعتماد کے ساتھ اپنی قوت کشش میں مکمل طور پر بےرحم... سلطنت نے سوچا کہ اس لمحے آخر اس عورت کے دل میں کیا خیالات آ رہے ہیں؟ آخر حسریت کیا کریں گے؟

شاید وہ غصے سے بھڑک اٹھیں گے اور چیختے ہوئے کہیں گے: "تم لوگ مجھے اکیلا چھوڑ دو!" لیکن نہیں۔ وہ تو اس شخص کی طرح جو قوت‌ارادی سے محروم ہو، کسی بھیڑ جیسی فرماں‌برداری کے ساتھ اس عورت کے پیچھے پیچھے چل دیا اور چلتے چلتے دھیرے سے کہا: "سلطنت، مجھے معاف کر دو!" وہ دونوں دور ہونے لگے۔ حسریت کو چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ سلطنت نے سوچا: "اب میں کیا کروں؟ دوڑ کے ان کے پاس جاؤں اور واپس بلا لاؤں؟ نہیں، وہ جانا چاہتے ہیں تو جائیں... جائیں، جائیں، جائیں!.." الفاظ اس کی کن‌پٹیوں میں دھڑکنے لگے۔ سلطنت غموں سے چکنا چور ہو کے رہ گئی اور ایسا لگا کہ آسمان پر آفتاب تک سیاہ پڑ گیا۔ نہیں، اب یہ آفتاب نہیں، تانبے کا ایک پیالہ تھا جس کی تہہ جل کے سیاہ ہو چکی تھی۔

ابالا عبدالعرشی نے ان دونوں کو نظروں سے اوجھل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے صرف سلطنت کو دیکھا اور تیزی کے ساتھ بکھرے ہوئے کاغذات کو سمیٹ کے سخت پریشانی کے عالم میں اس کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔ قریب پہنچ کے کچھ محتاط سا ہو گیا۔

"کیا بات ہے، کامریڈ سلطنت؟"

"ذرا مجھے سہارا دو!" سلطنت نے جس کے ہونٹ سفید ہو گئے تھے، منت کی۔

اس نے بوکھلاہٹ کے ساتھ سوچا کہ آخر وہ سلطنت کو سہارا کیسے دے؟ کیا وہ اسے چھونے کی ہمت کر سکتا ہے؟ چنانچہ وہ چپ‌چاپ کھویا ہوا، پست ہمت ہو کے کھڑا رہا جیسے اس سے کسی عمودی چٹان پر سے چھلانگ لگا دینے کو کہا گیا ہو۔

"ذلیل مخلوق" اچانک سلطنت نے حقارت بھری سرد مہری سے کہا۔

"نہیں، نہیں، میری مراد تم سے نہیں ہے ابالا۔ مجھ سے ڈرو نہیں، میرے پاس آؤ، میرے گھٹنے کپکپا رہے ہیں۔"

ابالا اس کے پاس گیا تو اس نے اس کے چھوٹے کمزور شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہی تھی۔ آخر ابالا کی مدد سے اس نے اپنے گھر کی سیڑھیاں طے کیں اور کسی نہ کسی طرح دروازے کے اندر جا کے سوفے پر گر گئی، منھ ایک تکیے میں چھپا لیا اور تلخی سے سسکیاں بھر کے رونے لگی۔ ابالا پریشان اور گھبرایا

ہوا کھڑا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا بدن سن ہو گیا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سلطنت کو کس طرح تسلی دے، اپنے ہاتھوں پیروں سے کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ اس وقت وہ سلطنت کو تسکین دے سکتا تو وہ خود کو دنیا کا مسرورترین آدمی تصور کرتا۔ آخر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک گلاس میں پانی انڈیلا۔

عشورعلی کو اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ پروقار اور ناقابل‌رسائی سلطنت کے دل پر غم‌وغصے کی کون سی کیفیت طاری تھی لیکن جب اسے دریا کے لاپتہ ہو جانے کی اطلاع ملی تو وہ اپنے دل میں پیدا ہونے والے ایک طرح کے اطمینان کے جذبے کو دبا نہ سکا۔ گاؤں کے معزز بڑے بوڑھے جس وقت نئے چرکیئی کے کھنڈرات کے پاس کھڑے ہوئے تھے اس وقت سلطنت کی برہمی کو وہ یقیناً حق بجانب تصور کر سکتا تھا لیکن جہاں تک اس کے اب‌ولہجے کا تعلق تھا اسے وہ بہت سخت اور شرمناک سمجھتا تھا! کل کی چھوکری اور سفید داڑھی والے بزرگوں سے ڈانٹ ڈپٹ کے باتیں کرنے کی ہمت؟

"اور اب خدا کی مرضی کا یہ ایک اور ظہور ہے۔ ہمارا سولاک ہی کہیں چلا گیا، لاپتہ ہو گیا" عشورعلی نے اپنے بازو پھیلا دئے۔ اس بار اسے واقعی یقین ہو گیا تھا کہ اس کی پیش‌گوئیاں صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔

"اور دریا نہ ہوگا تو" امیرخان نے دھیرے سے کچھ یوں کہا جیسے صرف اسی پر یہ پرمسرت انکشاف ہوا ہو، "تو باندھ تعمیر کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا، ٹھیک ہے نا؟" اس نے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو جھکایا۔

"کوئی احمق ہی ایسی جگہ باندھ تعمیر کر سکتا ہے جہاں پانی نہ ہو۔ ہی۔ ہی۔ ہی!" اور دنگیر - دنگارچو نے لنگڑے عثمان کا شانہ تھپتھپایا۔

"اس کا مطلب ہے" امیرخان نے انگوٹھی والی انگلی جھکا لی، "کہ باندھ نہ ہوگا تو بجلی گھر نہ بنے گا۔"

"یہ بات تو تمہیں کوئی بچہ تک بتا سکتا ہے کہ ٹربائنیں ہوا

سے نہیں چلا کرتیں" چنتارائی نے اپنے پھڑکتے ہوئے گال کو اپنے ڈنڈے پر ٹکاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"تب تو" امیرخان نے اپنی بیچ والی انگلی جھکا کے اپنی دوربینی کا مظاہرہ کیا۔ "جب بجلی گھر ہی نہ ہوگا تو ان بستیوں اور قصبوں کی ضرورت ہی کیا ہوگی؟ ٹھیک ہے نا؟"

"کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ صاف بات ہے۔"

"اور اس کا مطلب ہے کہ" امیرخان نے اپنی پہلی انگلی جھکا لی۔ "چونکہ اس سب کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے ہم لوگ اپنے مکانوں کی مرمت کر کے "عقاب نشیمن" میں سکون کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"لیکن تم نے ایک بات فراموش کر دی اور خاص بات وہی ہے" لنگڑے عثمان نے کہا۔

"وہ کیا؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں فراموش کیا۔"

"یہاں کوئی سمندر بھی نہ ہوگا۔"

"ہاں، ہاں" امیرخان نے اپنا انگوٹھا جھکا لیا پھر سب انگلیاں سیدھی کر کے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی۔ "سب کچھ ختم اور غائب!"

"سو تو ہونا ہی تھا۔"

"بھئی، معلوم ہے یہ کوہسار کتنے برسوں سے کھڑے ہیں؟ ہزار سال یا اس سے زائد سہی۔"

"اچھا، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"یہ ہوتا ہے کہ کوہسار اپنی اپنی جگہوں پر پورے استحکام سے کھڑے رہے ہیں اور اب اچانک انسان آ کے ان سے کہتا ہے: "گھاٹی میں تم ایک دوسرے سے ذرا قریب ہو جاؤ۔ یہاں ایک باندھ تعمیر ہونے جا رہا ہے"۔ اور انسان کو یہ ہے کوہساروں کا جواب!"

"اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں امداد دی جائے گی۔ پتھروں اور عمارتی لکڑیوں کا انتظام کر دیا گیا ہے تاکہ ہم اپنے مکانات کی مرمت کر کے گاؤں کو ٹھیک حالت پر لے آئیں" عشورعلی نے دھیرے سے کہا۔

"کیا یہ سچ ہے؟" امیرخان نے جوش کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں، سلطنت نے آج صبح یہی کہا ہے۔"

"تب تو بات بالکل واضح ہے۔ ہم لوگوں کو دوسری جگہ نہ منتقل کیا جائے گا اور کوئی بجلی گھر نہ بنے گا۔"

"احمق کہیں کے!" اچانک عشورعلی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "سوویت حکومت اتنی بےوقوف نہیں ہے کہ اتنے زبردست مصارف کو یونہی ضائع ہو جانے دے۔ پانی نہ ہوگا تو دیکھ لینا وہ لوگ آ کے ڈھلواں چٹانوں کے درمیان ایک ایٹمی بجلی گھر بنا دیں گے" اس نے اپنی بات ختم کی تو خود اپنے اس اندازے سے خوف‌زدہ ہو کے رہ گیا۔

"ہاں بھئی، کمیونسٹ بڑے ضدی ہوتے ہیں۔ میرے لئے تو اپنے داماد کی مثال سامنے ہے" چنتارائی غصے سے بڑبڑایا۔ "مجھے بھی خدا نے کیسا داماد دیا ہے۔ ایک بار میں نے اسٹول کی مرمت کرنے کے لئے گودام سے لکڑی کا ایک تختہ لے لیا تھا۔ اس معاملے پر میری بیٹی نے اتنا ہنگامہ کھڑا کیا کہ نہ پوچھو۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ اسٹول اس کے سر پر مار کے توڑ ڈالوں۔"

"تمہیں افسوس نہ ہوا ہوتا؟"

"کاہے کا؟"

"ارے اسٹول کا اور کاہے کا۔ ہی-ہی-ہی!"

دریا کے غائب ہو جانے کی خبر تمام تعمیراتی کارکنوں اور خاص طور سے باندھ اور بجلی‌گھر کی تعمیر سے براہ راست تعلق رکھنے والوں کے لئے الجھن کا باعث تھی۔ ان کے علاوہ اچھے اور دلکش پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے - سرنگیں کاٹنے اور چٹانوں سے ملا کر فولادی ڈھانچے کھڑے کرنے والے۔ ان لوگوں کو ایک طرح کی مخصوص اہمیت حاصل تھی اور ان کا دوسروں سے کچھ زیادہ ہی احترام کیا جاتا تھا لیکن اب گھبراہٹ اور پریشانی کے معاملے میں سب کا ایک جیسا حال تھا: "آخر یہ کیسے ہوا؟ ایک دریا ہوا کرتا تھا، چیختا چنگھاڑتا اور جھاگ اڑاتا ہوا اور اب بالکل اچانک ہی غائب ہو گیا۔ جادو کی طرح!" لوگوں کی الجھن نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ ہر شخص حیرت میں ڈوبا ہوا تھا، ہر شخص - تعمیرات کے سربراہ سے لے کر جو زبردست قدوقامت کا

یوکرینی تھا (صرف مونچھوں کا اضافہ کر دیا جاتا تو وہ تاراس بولبا* بن جاتا) عام کرین آپریٹر تک، ہر شخص۔ مخصوص کمیشن کے ارکان بھی بہت فکرمند تھے۔ وہ سوچ رہے تھے: "کیا یہ ممکن ہے کہ ہر چیز ناکام ہو گئی ہو؟ اتنے زبردست پیمانے کا کام ضائع ہو گیا ہو؟ اور کیا اس پروجیکٹ کو جسے فخریہ انداز سے شمالی قفقاز کا سب سے بڑا پروجیکٹ کہا گیا تھا، ترک کر دینا پڑے گا؟"

ہر قسم کی باتیں تھیں، افواہیں تھیں اور اختراع پسند مفروضات۔

"اس سب کا مطلب کیا ہے؟"

"چرکیئی میں لوگ کہتے ہیں کہ یہ آسمان سے ملنےوالی ایک آگاہی ہے۔"

"یہ سب مہمل ہے۔ ہم دریا کو تلاش کر لیں گے، وہ ہم سے بچ کے نہیں جا سکتا۔ اور ضرورت پڑی تو اسے زمین کے نیچے سے بھی برآمد کر لیں گے!"

"ہیلی کاپٹر! دیکھنا، وہ رہا ہیلی کاپٹر!"

یہ ہیلی‌کاپٹر جسے مراد چلا رہا تھا، دریا کے راستے کی طرف جا رہا تھا کیونکہ اوپر سے تمام صورت حال کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مصطفے کی منظم کی ہوئی ایک مہم کے ارکان بھی جن کی وہ خود ہی قیادت کر رہا تھا، گھاٹی سے پیدل بڑھ رہے تھے۔ یہ لوگ رک رک کے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے اور آوازیں سنتے ہوئے دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے جیسے اوسوری تائیگا میں شیر کا شکار کرنے والے بڑھتے ہیں۔ لیکن یہ آبی "شیر" جو سولاک گھاٹی میں کہیں چھپا ہوا تھا، کسی بھی وحشی درندے سے زیادہ خوفناک تھا۔ بہت ممکن تھا وہ زمین‌دوز ہو گیا ہو اور ابھی اسی جگہ کسی زبردست فوارے کی طرح پھوٹ نکلے اور اپنے راستے میں حائل ہونے والی ہر چیز کو بہا لے جائے۔

لیکن جلدی ہی پتہ چل گیا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ زلزلے سے

---

* یوکرینی مصنف تاراس شیف‌چنکو کے اسی نام کے ناول کا خاص کردار۔ اڈیٹر۔

ایک چٹان گر پڑی تھی۔ چرکیئی سے بلندی پر دریا کے بائیں کنارے بہت بڑی چٹان ٹوٹ کے نیچے گر پڑی تھی اور پل بھر کے اندر ہی خود قدرت نے ایک باندھ کو جنم دے دیا تھا۔ اس طرح ایک زبردست جھیل وجود میں آ گئی تھی جس میں مختلف اندازوں کے بموجب ۵۰ لاکھ مکعب میٹر سے کم پانی نہ رہا ہوگا۔

دریا کو چٹانوں کے زبردست گھیرے میں مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے پایا گیا لیکن اس کا پتہ چلنے کی خوشی تھوڑی ہی دیر تک باقی رہی۔ آبی وسائل کے ماہرین جلد ہی اس جھیل کے پاس پہنچے جنھوں نے صورت حال کا جائزہ لیا، تخمینے اور حساب لگائے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مصیبت آن پڑی۔

"مزید مصیبت؟"

"لیکن اس کا سلسلہ آخر ختم کب ہوگا؟"

"کیا یہ مصیبت بہت زیادہ نہیں ہے؟ انسان کا صبر آخر کتنی آزمائشوں کو برداشت کر سکتا ہے؟.."

اس قدرتی باندھ کے ٹوٹ جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کا پانی چرکیئی باندھ کے لئے کھودی گئی زبردست خندق میں طغیانی لے آتا اور صرف قریبی مواضعات ہی کو نہیں بلکہ چریورت پن بجلی گھر کو بھی، جو بجلی پیدا کر رہا تھا، بہا لے جاتا۔ اس سے کچھ اور آگے دامن کوہ میں واقع "اسپوتنک" بجلی گھر بھی بہہ جاتا۔ اس صورت حال سے داغستان کے دارالخلافہ مخاچ‌قلعہ میں پانی کی فراہمی کے نظام کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور دریا کے بہاؤ کے رخ پر کنارے کنارے واقع مواضعات اور شہروں میں طغیانی آ جانے کا اندیشہ تھا۔ خطرہ بہت سنگین تھا اور اس کی سنگینی میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پانی اس جگہ اکٹھا ہوتا جا رہا تھا اور کسی بھی لمحے اس عارضی رکاوٹ کے جواب دے جانے سے پھوٹ کے زبردست تباہی و بربادی لا سکتا تھا۔

چاروں طرف عجلت کے ساتھ ہدایات بھیجی جانے لگیں:

"ایک مخصوص ہنگامی گروپ پارٹی تنظیم کے سکریٹری مصطفے کی قیادت میں تشکیل دے کے اس جگہ کو روانہ کیا جائے جہاں چٹان ٹوٹ کے نیچے گری ہے۔"

"انتسوکول، گیرگی‌بل اور سوویتسکی علاقوں کی پارٹی کمیٹیوں کو امداد روانہ کرنے کی ہدایات کی جائیں۔"

"ہوائی اڈے کا مینجر ہیلی‌کاپٹروں وغیرہ کا انتظام کرے جو دھماکے سے چٹان توڑنے والے ماہرین کو موقعے پر پہنچائیں۔"

"تمام مقامی ذمےداران خطرے کے علاقوں سے آبادی کے تخلیے کے لئے فوری اقدامات کریں..."

"رات میں؟"

"ہاں، رات میں اور علی‌الصباح-فوری طور پر۔ اس کام میں سب سے قیمتی چیز جسے بچانا ہے وہ ہے لوگوں کی جان۔"

مزید خطرے کی آگاہی، تشویش اور پریشانی۔ بعض لوگ تو بالکل ہی بدحواس ہو گئے اور یہ کہتے ہوئے جلدی جلدی اپنا سامان اکٹھا کرنے لگے: "نہیں، اب میں بہت جھیل چکا۔ اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ ایک دن بھی، ایک گھنٹہ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ جتنی جلدی ممکن ہوگا کسی ٹرک میں بیٹھ کے جا رہا ہوں!"

شکار غم

وہ لوگ جو کلیجر سے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ تعمیراتی کارکن اس علاقے سے چلے جائیں گے اور بعد میں وہ سکون سے زندگی بسر کر سکیں گے، وہ لوگ جس وقت خدا کی مرضی کے متعلق باتیں کر رہے تھے، بھلا یہ کیسے جان سکتے تھے کہ لاپتہ ہونے والا دریا، ایک زبردست جھیل کی شکل اختیار کر کے ان کے لئے، خود ان کی زندگیوں کے لئے نہایت ہی سنگین خطرہ بن چکا ہے؟ چرکیئی کے لوگ جو زلزلے کے جھٹکے رک جانے کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے، بھلا یہ سب کیسے جان سکتے تھے؟ وہ تو نہایت ہی پرامید طور پر یقین کر چکے تھے کہ ان کے تمام اندیشوں اور مصیبتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

سلطنت کو جو اپنے غم میں تنہا کھوئی ہوئی تھی اور کسی سے ملنا نہیں چاہتی تھی، اس نئے خطرے کی اطلاع ابالا عبدالعرشی نے دی۔ وہ ڈرا سہما دبے پاؤں سلطنت کے کمرے میں داخل ہوا۔ سلطنت

لاپروائی سے ایک ہلکی رضائی اوڑھے، اپنے پلنگ پر لیٹی تھی کہ اسے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔

ابالا عبدالعرشی جلدی سے اس پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد ڈر کے دریچے کی طرف مڑ گیا۔ باہر پاپلر کے درخت کی چوٹی ہوا میں جھوم رہی تھی۔ سیاہ شاخیں، سیاہ پتیاں اور ان کے اوپر ماہتاب، دہشت طاری کرنے والے بادلوں کے درمیان جال میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح کسمساتا ہوا۔ اس کی دھیمی، پرسکون روشنی سلطنت پر، اس کے شانوں اور گردن پر پڑ رہی تھی اور اس کا چہرہ تاریکی میں تھا۔ ابالا یہ سوچ کر دبے پاؤں مڑا کہ وہ سو رہی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسی جگہ بےحس و حرکت کھڑا، اس پر اپنی نگاہیں قربان کرتا رہے لیکن اس کی آواز سن کر چونک پڑا:

"کیا یہ تم ہو؟"

اس آواز کو سن کے وہ کچھ شرمایا اور اس کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔

"میں ہوں، کامریڈ چیرمین" چپ چاپ کھڑے ہو کے سلطنت کو دیکھتے رہنے کی بےتصنع خواہش کی جگہ اب اس کے دل میں ایک تلخ تاسف نے لے لی، آخر وہ کوئی شاعر، کوئی مصور یا مجسمہ‌ساز کیوں نہیں تھا؟ کیسی خوبصورت نظم اس نے سلطنت کے بارے میں لکھی ہوتی، کتنے پیارے رنگوں سے اس کی تصویر بنائی ہوتی!

"مجھے یوں نہ مخاطب کرو!" سلطنت رو پڑی اور ابالا کا دل درد و کرب سے ڈوبنے سا لگا۔

"معاف کیجئےگا کامریڈ سلطنت، میں آپ کو یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ تباہی سر پر منڈلا رہی ہے..."

"اب کون سی تباہی منڈلا رہی ہے؟" سلطنت نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میرے لئے خود اپنی ہی تباہی کیا کم ہے۔ کچھ تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا؟ یہاں سے چلے جاؤ!"

"یہ ممکن نہیں! کامریڈ سلطنت، میں خلوص دل سے آپ کے متعلق فکرمند ہوں۔ بس مجھے یہ بتا دیجئے کہ میں کس طرح آپ کی مدد کروں۔ میں تو..." اس کی آواز کانپنے لگی اور اس نے بہت دھیرے سے کہا: "میں تو اپنی جان تک دے سکتا ہوں..." اور یہ

خالی خولی ڈینگ مارنے والے الفاظ نہ تھے۔ ان کے پیچھے اس کے غموں میں شریک ہونے کا، اس کے بار کو ہلکا کرنے کا سچا جذبہ کارفرما تھا۔ "ایک ٹیلیفون آیا تھا، ہمیں فوری طور پر سب لوگوں کا تخلیہ کرانا ہوگا۔ کہا گیا ہے کہ آپ، لوگوں کی زندگیوں کی ذمے‌دار ہیں۔"

"لیکن میری زندگی کے لئے کون جوابدہ ہے؟ میں بھی تو آخر انسان ہوں! مجھے میرے درد و غم میں تنہا میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"کامریڈ چیرمین... کامریڈ سلطنت، اس وقت ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے، خطرہ..."

"اچھا تو بتاؤ، ہوا کیا؟"

"ایک بڑی پہاڑی چٹان ٹوٹ کے گر پڑی ہے اور اس کے عقب میں زبردست جھیل بن گئی ہے۔ پانی کسی بھی لمحے رکاوٹوں کو توڑ کے بہہ سکتا اور ہر طرف طغیانی لا سکتا ہے" اس نے رک رک کے کہا۔

"لیکن میں لوگوں کو آخر لے کہاں جاؤں؟ اور وہ بھی نصف شب کو!" سلطنت نے بوکھلاہٹ کے عالم میں پوچھا۔ "سب لوگ تو سو رہے ہیں!" وہ کھڑی ہو کے جلدی سے اپنا بلاوز پہننے لگی۔

"اخروٹ کے درختوں کے جھنڈ میں ٹرک پہنچ رہے ہیں..."

"اچھا، میں ابھی چلتی ہوں۔ ریڈیو پر تمام باتوں کا اعلان کر دو!"

"ریڈیو تو کام ہی نہیں کر رہا ہے۔"

"تو پھر گاؤں میں گھوم پھر کے سب کو اطلاع کرو۔"

"اچھی بات ہے، کامریڈ سلطنت!" اور ابالا عبدالعرشی خوشی خوشی وہاں سے چلا گیا جیسے اس نے کسی بلند درے کو پار کر لیا ہو، جیسے وہ کسی زبردست آزمائش پر پورا اترا ہو۔

سلطنت کام کے وقت کپڑوں کے اوپر پہننے کی موٹے کپڑے کی اوپری پوشاک اور بھدے بوٹ پہن کے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ اس اثنا میں دروازے اور گیٹ چرمرانے لگے تھے، کتے بھونک رہے تھے، لوگ ایک دوسرے کو پکار پکار کے دریافت کر رہے تھے کہ آخر ہوا کیا، آخر اب اور کون سی مصیبت نازل ہو گئی۔

ایسے موقعوں پر گھبراہٹ اور دہشت سے بچنا تقریباً ناممکن

ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو پکارتے ہوئے، چیختے چلاتے ہوئے، لعنت بھیجتے ہوئے جلدی کرنے پر زور دے رہے تھے۔ گھر گرہست عورتیں اپنے مویشیوں، اپنی گایوں اور بچھڑوں کو بھر قیمت ساتھ لے جانے پر مصر تھیں۔ کوئی شخص ایک زبردست صندوق کو گھسیٹ کے اپنے گیٹ تک لے آیا تھا اور ہر ایک سے کہہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کے چلنے میں اس کی مدد کرے۔ ماہتاب نے بھی ابر کے ایک ٹکڑے کے پیچھے چھپ جانے کے لئے اسی وقت کا انتخاب کیا اور چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ جیبی ٹارچیں جہاں تہاں روشنی بکھیرنے لگیں اور بچے ماؤں کے لئے رونے اور زور زور سے چلانے لگے۔ پھر بجلی کا ایک کوندا لپکا اور بادل گرجنے لگے۔ یہی ایک کسر باقی رہ گئی تھی، اب تیز بارش ہونے والی تھی۔ قدرت بڑی سنگدلی سے برہمی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور لوگ بالکل بدحواس ہو گئے تھے۔ خوف‌زدہ عورتیں بچوں کو کلیجے سے لگائے ہوئے ادھر ادھر بھاگتی پھرتی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں: "آخر ہم لوگ کہاں جائیں؟ سب لوگ کہاں گئے؟ ذرا میری مدد کرو، بچاؤ!" عام تشویش اور پریشانی کے زیراثر گائیں ڈکرا رہی تھیں اور کتے دیوانہ‌وار بھونکے جا رہے تھے۔

جہاں سب سے زیادہ افراتفری دکھائی دیتی وہیں سلطنت کی تسلی دینے والی آواز سنائی دیتی۔ ان حالات میں بدحواس ہو جانا بہت آسان تھا لیکن جن کو لوگوں کو خطرے کے علاقے سے منتقل کرانے کا کام سپرد کیا گیا ہو، ان کو ایسا کرنے کا حق نہیں تھا۔ انہیں تو ہوش و حواس بہرحال درست رکھنا ہی تھا۔ آخر میں ان لوگوں کو اسی میدان مرتفع کو لے جایا گیا جہاں نیا چرکیئی کھنڈرات کی شکل میں کھڑا ہوا تھا۔ اگلے روز دوپہر کو خبر ملی: "خطرہ دور ہو گیا ہے!"

ڈائنامائیٹ ماہرین نے تھوڑا تھوڑا کر کے پانی کو خارج کر دیا تھا۔

سلطنت جو رات کی بھاگ دوڑ کے بعد تھکن سے چور، کمزور اور بدحال سی نظر آ رہی تھی، دوسرے لوگوں کے ساتھ گاؤں روانہ ہو گئی۔ سب لوگ دھیرے دھیرے پاؤں گھسیٹتے ہوئے چل رہے تھے اور انہیں ابھی تک یقین نہیں ہوا تھا کہ پریشانیوں کا سلسلہ ختم ہو

گیا۔ پل پار کرنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ فکرمند سے کچھ افراد کرمچ کی چادر پر کچھ رکھے ہوئے لئے آ رہے ہیں۔ مصطفے بھی ساتھ تھا۔ وہ دریا کے کنارے والے راستے سے گزر رہے تھے، اتنے میں سامنے والے لوگ ٹھہر کے ان کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ سلطنت جو تھکی ہوئی اور ہر چیز سے قطعاً بےنیاز سی ہو رہی تھی، آگے بڑھ جانے کو تھی لیکن اتنے ہی میں اس نے کسی کو کہتے سنا: "اور کتنی خوبصورت تھی... کیسی جوان بھی تھی!" وہ یکبارگی مڑ کے لوگوں کو ہٹاتی ہوئی قریب پہنچی اور اسے ایک عورت کی لاش نظر آئی۔ ہاں، یہ اسی کی لاش تھی، سیاہ خامس کی۔ اس کی لاش کو دیکھ کے بھی سلطنت کے دل میں نفرت کی سی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتی رہی جس پر اب ہر شے سے دستبردار ہونے کی کیفیت طاری تھی۔

"سلام علیکم، سلطنت" وہ مصطفے کی آواز سن کے چونک پڑی۔

"افسوسناک واقعہ ہے۔ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کون تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ دبکی کے ہاسٹل میں رہتی تھی۔"

"ڈوب کے خودکشی کر لی کیا؟" بوڑھوں میں سے ایک نے دریافت کیا۔

"کون جانے۔ ہو سکتا ہے کہ محض حادثہ ہو۔"

"خیر، اس کی تفتیش کر لی جائے گی۔"

"پانی باہر نکالا جا چکا تو وہ جھیل کی تہہ میں پائی گئی۔"

سلطنت کچھ کہے بغیر مڑ کے کچھ اور دھیرے دھیرے، نگاہیں جھکائے خیالوں میں کھوئی سی چلنے لگی۔ پھر اچانک ٹھہر کے مڑی اور مخالف سمت میں دوڑنے لگی، دبکی پہنچنے کے لئے جہاں حسریت کو ہونا چاہئے تھا۔ حسریت کہاں تھا؟ وہ خود دوڑی ہوئی کہاں جا رہی تھی؟ اور کیوں؟ اس کے ذہن میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ خیالات نے تیزی سے بھاگ دوڑ مچا رکھی تھی جیسے ہوا میں بادل اڑ رہے ہوں۔ اس کی حریف کی موت سے بھی اس کے وقار کو لگنے والے زخم کا درد کم نہیں ہوا تھا۔ تو پھر آخر وہ کون سی بات تھی جو اسے تیزی سے بھگائے لئے جا رہی تھی؟..

پانچواں باب

جس میں دکھایا گیا ہے کہ مصیبت میں انسان کس طرح لوگوں کو پہچاننا سیکھتا ہے اور کس طرح ایک اجنبی سفید چڑیا "عقاب نشیمن" میں آ بسی۔

اچھے شجر کی گہری جڑیں

آخرکار ایسا محسوس ہوا کہ مصائب کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ لوگوں نے اطمینان کی سانس لی اور یہ دیکھنے اور اندازہ لگانے کے لئے کہ کیا تباہ ہو گیا، کتنا نقصان پہنچا ہے، کس چیز کی مرمت کی جا سکتی اور کسے ازسرنو تعمیر کرنا ہوگا، گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مظہر قدرت کے حملے سے جو زخم پہنچے تھے لوگ ان کا علاج کرنے لگے اور داغستان کے اس المیہ کے موقعے پر سارے ملک نے ہاتھ بٹایا۔ لوگوں کی محبت اور برادرانہ امداد سے مقدس اور عمدہ بھلا اور کیا چیز ہو سکتی ہے!

ملک کے کونے کونے سے - کاریلیا سے آرمینیا تک اور کامچاتکا سے بالٹک ری‌پبلکوں تک - ہر جگہ سے تار موصول ہوئے۔

"ہم آپ کی کس طرح مدد کریں؟"

"دو ہزار خیمے اور ایک ہزار سلیپنگ بیگ روانہ کئے ہیں۔"

"مصیبت‌زدگان کو ہمارے یہاں بھیجنے کے امکانات سے مطاع کیجئے۔ ہم ایک ہزار افراد کے قیام و طعام کا انتظام کر سکتے ہیں۔"

"مصیبت‌زدگان کے لئے ہماری طرف سے دو ٹرک آٹا اور سو بھیڑیں!"

"میں ڈائنامائیٹ ماہر ہوں، آپ لوگوں کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں کمیونسٹ ہوں، تعمیراتی شعبے کا فورمین۔ مصیبت‌زدہ علاقوں میں مدد کرنے کے لئے آنے کو تیار ہوں۔"

"ہمارا بورڈنگ اسکول، اسکولی بچوں کے قیام کا انتظام کر سکتا ہے۔ ہم ان کی اپنے بچوں کی طرح دیکھ بھال کریں گے۔"

"ہم آپ کے لئے ایک اسکول تعمیر کر دیں گے!"

"میری ٹیم آ کے عمارتوں کی تعمیر میں مدد کرنے کو تیار ہے!"

"ہم ایک بستی تعمیر کریں گے۔ منصوبہ بنانے والے روانہ ہو چکے ہیں، ان کا استقبال کیجئے!"

"میرا خاندان چھوٹا اور حالات اچھے ہیں۔ ہم دو بچوں کو اپنے یہاں رکھ کے ان کی پرورش کر سکتے ہیں۔"

جمہوریہ کے دارالخلافہ کے مرکز میں ملک کا ایک نقشہ لٹکا ہوا ہے جس میں رسل و رسائل کی لائنیں دکھانے والی آڑی ترچھی لکیروں کا جال سا بنا ہے۔ ذرا دیکھئے تو یہاں کتنی زیادہ لکیریں آ کر مل گئی ہیں۔ کتنے زیادہ شہروں سے یہ لائنیں آئی ہیں۔ ماسکو، لینن‌گراد، کوئیبیشیف، سویردلوفسک، کالینن، کیروف، فرونزے، آرجونی‌کیدزے، گورکی اور جانے کتنے شہروں سے آنے والی لائنیں۔

۲۱ مئی ۱۹۷۰ء کو مندرجہ ذیل تار موصول ہوا:

"سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور سوویت یونین کی وزارتی کونسل داغستان کے علاقوں — بوئی‌ناق، گومبیت، کزبیک اور قزل‌یورت کے محنت‌کش عوام سے زلزلے کے سلسلے میں جس نے انسانی جانیں لیں اور متعدد رہائشی عمارات کو تباہ و برباد کر دیا، گہری ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں۔

ہمیں ان خاندانوں سے جن کے عزیزوں کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے، ان کے اس نقصان کے سلسلے میں خاص طور سے ہمدردی ہے۔

سوویت یونین کی حکومت، روسی فیڈریشن کی وزارتی کونسل اور جمہوریہ کے مقامی نظم و نسق کے ادارے زلزلے کی لائی ہوئی مصیبتوں کے خاتمے اور مصیبت‌زدگان کو امداد پہنچانے کے لئے تمام اقدامات کر رہے ہیں"۔

بھائی‌چارے کی طاقت، بےحد احترام کی مستحق

چرکیئی کے لوگ گاؤں سوویت کے احاطے میں مختلف مسائل سے نپٹنے اور موصول ہونے والی امدادی اشیا کی تقسیم کا طریقۂ‌کار طے کرنے کے لئے متعدد بار اکٹھا ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ گھروں

کو ٹھیک حالت میں کئے جانے کا وقت ہو چکا ہے۔ پن بجلی گھر تعمیر کرنے والے کارکنوں نے درجنوں ٹرک پتھر کے چوکے اور عمارتی لکڑی بھیجی تھی اور یہ امداد کیا قابل قبول نہ تھی؟ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ جدید وضع کے نئے چرکیئی کی تعمیر شروع ہو چکی ہے تو آخر قدیم گاؤں کے گھروں کی مرمت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن دوسروں نے بہت معقول جواب دیا: "اس کی تعمیر مکمل ہونے تک ہمیں کہیں نہ کہیں تو بہرحال رہنا ہی ہوگا۔"

یہ بات خاص طور سے نمایاں تھی کہ سلطنت کے سلسلے میں لوگوں کا رویہ پہلے سے کہیں مختلف ہو گیا تھا۔ کیوں؟ آخر ہوا کیا تھا؟ کیا اس کے غموں نے اس کی عمر کچھ بڑھا دی تھی، اس کی دلکشی میں کمی پیدا کر دی تھی؟ جی نہیں، دیکھنے میں سلطنت میں کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا تھا سوا اس کے کہ کنپٹیوں پر کچھ بال سفید ہو گئے اور آنکھوں کے نیچے خفیف سے حلقے پڑ گئے تھے۔ لیکن پھر آخر اور کیا ہوا تھا؟ اتنے زیادہ لوگوں کے رویے میں اس کے متعلق سردمہری کیوں پیدا ہو گئی تھی؟ ابالا عبدالعرشی تک، ایسا لگتا تھا کہ پہلے کی طرح جان نہیں نثار کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ حسریت کی وجہ سے ہوا تھا اور اس روز جبکہ سیاہ خامس جو واقعی اس بےچارے ایکی بولاق والے خاراخور مرحوم کی رشتےدار تھی، مری ہوئی پائی گئی تھی۔ چھان بین سے پتہ چلا تھا کہ وہ یونیورسٹی کی طالبہ تھی تب ہی ایک مرد نے جو اس کی محبت کی قسمیں کھاتا رہتا تھا، اسے نہایت ہی سنگدلی سے اپنے فریب کا نشانہ بنایا تھا۔ اس واقعے کے بعد وہ تعلیم نامکمل چھوڑ کے کہستانی علاقے کو چلی آئی تھی لیکن غم و آلام نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا...

اس المناک واقعے کے روز جبکہ خامس مردہ پائی گئی تھی، سلطنت اس اندیشے سے کہ کہیں حسریت کو کچھ ہو نہ گیا ہو، اس کی تلاش میں بھاگی بھاگی دبکی گئی جہاں اس نے اسے مزدوروں کے ہاسٹل میں نشے میں دھت پایا تھا۔ وہ ایک ناقابل برداشت خوف کے زیراثر بھاگی ہوئی وہاں پہنچی تھی، اسے پا بھی گئی تھی لیکن اسے اس حالت میں دیکھ کر سوچنے لگی تھی کہ کاش وہ نہ ملا ہوتا۔

خامس کی موت کے بعد واقعے کی تفتیش کرنے والے ذمےدار نے حسریت سے بہت دیر تک پوچھ گچھ کی اور بہت ممکن تھا کہ اس پر اس واقعے میں ملوث ہونے کا الزام بھی لگایا جاتا۔ لیکن اس کی خوش‌قسمتی سے اسے موقع واردات پر عذر غیرموجودگی میسر آ گیا تھا کیونکہ اس لڑکی کو حسریت کے پاس سے آنے کے بعد بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا۔ بہرحال اس کی موت سے حسریت کی حالت خراب ہو گئی اور وہ ہمیشہ سے زیادہ شراب پینے لگا۔ سلطنت نے جلد ہی اس سے علاحدگی اختیار کر لی اور اسے لازمی علاج کے لئے بھیج دیا گیا... غالباً یہی وجہ تھی کہ گاؤں کے لوگ اب سلطنت کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

"ہونہہ، نکمی بدتمیز عورت، ذرا دیکھو تو، اس نے اپنے شوہر کو کس حال کو پہنچا دیا" بڑی بوڑھیاں غصے سے دانت پیستی ہوئی کہتیں۔

"اور بےچارہ کتنا اچھا آدمی تھا۔"

"شراب ضرور پیتا تھا مگر اس کے پیچھے کوئی سبب بھی تو ہوگا۔ یقیناً اس کے لئے یہی عورت ذمےدار تھی۔"

"اور نہیں تو کیا، اس نے غریب کو مےنوشی پر مجبور کر دیا..."

"بھلا کوئی ایماندار، کوئی کہستانی عورت کسی مرد کو جیل بھجوا سکتی ہے؟ خاص طور سے جبکہ وہ اس کا شوہر بھی ہو..."

"جیل تو نہیں، اسپتال گیا ہے۔"

"اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے، لے تو گئی تھی اسے میلیشیا ہی۔"

"اور ذرا اسے دیکھو تو، شرم تک نہیں آتی۔ بےحیا کہیں کی۔"

"میں پوچھتی ہوں، آخر اس عورت کے لئے شکایت کی بات ہی کیا تھی؟"

"شوہر کوئی معمولی شخص، کوئی مویشی چرانے والا تو تھا نہیں۔ وہ تو انجینیر تھا، تعلیم‌یافتہ، سمجھدار، نیک، فیاض اور خوش‌اخلاق۔ سامنا ہونے پر ہمیشہ سلام کیا کرتا تھا۔"

"اور کبھی کبھار گھونٹ دو گھونٹ پی ہی لیا کرتا تھا تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

عورتیں اس طرح کی باتیں کرتی رہتی تھیں اور یہ وہی عورتیں تھیں جن کو خود اپنے شوہروں کے ہاتھوں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کہستانی مرد اس انداز سے نہیں سوچتے تھے، وہ جوان عورت کے سلسلے میں نرم رویہ اپناتے ہیں۔ لیکن یہ ظالم کہستانی عورتیں! ان کا تو عجب حال تھا، زندگی کے تمام طوفانوں اور آزمائشوں کے سلسلے میں وہ صرف خود کو قصوروار ٹھہراتیں اور اپنے شوہروں کو معاف کر دیا کرتی تھیں۔ ان حالات میں بہ آسانی تصور کیا جا سکتا ہے کہ سلطنت کے لئے اپنے اوپر پڑنے والی ناپسندیدگی کی ان نگاہوں کو برداشت کرنا کتنا دشوار رہا ہوگا۔ اب لوگ اپنے مختلف مسائل کے سلسلے میں پارٹی سکریٹری مصطفے سے زیادہ رابطہ قائم کرتے تھے۔ پہلے کبھی سلطنت کے دل میں خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وہ کسی-دن اپنے گاؤں اور ان لوگوں کو جو اس سے محبت کرتے تھے، چھوڑ کے کہیں چلی جائےگی۔ لیکن اب وہ بار بار سوچتی کہ ہر چیز کو چھوڑ کے چلی جائے۔ "تمام لوگوں کو نئے چرکیئی میں منتقل کرنے کے بعد خود بھی وہاں چلی جاؤں‌گی" وہ سوچتی۔

تعمیراتی کام جاری تھے لیکن ساری باتیں خوش‌اسلوبی ہی سے نہیں انجام پا رہی تھیں۔ کچھ لوگ دہشت کے عالم میں جاگ جاگ کے راتیں بسر کرتے کرتے اوسان کھو چکے تھے۔ ایسے لوگ کام چھوڑنے کی نوٹس دیتے، اپنا حساب کراتے اور پروجیکٹ سے چلے جاتے تھے۔ سونیا بھی اپنے شوہر قیت‌مس اور بیٹے نادر کے ساتھ چلی گئی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ قیت‌مس نے بزدلی دکھائی۔ لیکن اس معاملے میں قطعی طور پر کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ اس کے وہاں سے چلے جانے کی کوئی اور وجہ رہی ہو۔ بہرحال ایک بات یقینی تھی اور وہ یہ کہ جانے والوں میں زیادہ‌تر لوگ وہی تھے جن میں آزمائشوں پر پورے اترنے کی قوت کا فقدان تھا۔ چرکیئی کے لوگ انہیں ہمدردی کے ساتھ الوداع کہتے، قدرے روکھے پھیکے انداز میں ان سے رخصت ہوتے اور خوش بختی کی نیک خواہشات ظاہر کرتے لیکن جہاں تک بڑے بوڑھوں کا تعلق تھا انہوں نے اداس ہو کر سوچا کہ اتنے تھوڑے سے لوگ واپس جا رہے ہیں تو باندھ کی تعمیر کے ترک کئے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔

ان کا یہ خیال صحیح ہی تھا کیونکہ واقعی بہت تھوڑے سے لوگ واپس گئے اور کام جاری رہا۔ کارکنوں کی خاص ٹیمیں جن میں پائیدار اتحاد قائم تھا، مشکلات اور خطرات سے پست‌ہمتی کا شکار نہیں ہوئیں۔ انہوں نے مشکلات سے یہ کہنے کی جرأت کی: "ہمیں کوئی روک نہیں سکتا، ہم نے جو کام شروع کیا ہے اسے پایہ تکمیل تک پہنچائیں‌گے!" سائنس‌دانوں اور انجینیروں نے اپنے تخمینوں اور منصوبوں کا از سر نو جائزہ لیا، ضروری اقدامات کر لئے تاکہ عمارتیں اور دوسری تعمیرات زلزلے کے اس سے بھی زیادہ طاقتور جھٹکوں کو بھی جھیل سکیں۔

گاؤں سوویت کے دفتر کے احاطے میں اکثر ہونے والے جلسوں میں مختلف النوع موضوعات اور مسائل زیر بحث آتے تھے لیکن جہاں تک بڑے بوڑھوں کا تعلق تھا، ان کے لئے ہمیشہ وہی ایک ہی تکلیف‌دہ سوال توجہ کا مرکز بنا رہتا: "کیا ہمیں واقعی اپنے گھروں کو چھوڑنا پڑےگا؟"

"تو بھئی مصطفے، یہ بات واقعی بہت سنجیدہ حیثیت رکھتی ہے؟"

"بالکل یقینی طور پر۔"

"اور ایک نیا چرکیئی وجود میں آئےگا؟"

"تعمیر کیا جا رہا ہے تو وجود میں آئےگا ہی۔"

"لیکن یہ بھی منہدم ہو گیا تو؟"

"جی نہیں، معزز بزرگو، اس بار قطعی نہیں گرےگا!" حالیہ دنوں کے خطرات اور الجھنوں نے، ایسا لگتا تھا کہ پارٹی سکریٹری کو کچھ اور زیادہ ہی پرعزم بنا دیا تھا۔

"لیکن زمین پھر ہلنے لگی تو؟"

"تو کوئی فرق نہ پڑےگا۔ ہم تو ایسی عمارتیں تعمیر کر رہے ہیں جنہیں زلزلوں سے نقصان نہ پہنچ سکےگا۔ ان کی پائیداری اور استحکام کی ہم خود آزمائش بھی کر لیں‌گے۔"

"وہ کیسے؟ کیا تم لوگ خود ہی زمین کو ہلاؤگے؟" امیرخان نے ایک عیار مسکراہٹ کو اپنی آنکھوں میں چھپائے ہوئے دریافت کیا۔

"جی ہاں، خود ہی۔"

"اچھا، اچھا، دیکھیں‌گے بھئی ہم لوگ" امیرخان نے گہری

ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ دل ہی دل میں شاید وہ گاؤں سے اپنی منتقلی کی تکلیف‌دہ تجویز پر جزوی طور سے مجبوراً آمادہ ہو چکا تھا لیکن اسے تسلیم کرنے کے سلسلے میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

"عقاب نشیمن" میں سفید چڑیا

عشورعلی کو آخر ایسی کون سی عجیب و غریب چیز نظر آ گئی تھی؟ خاص طور سے ان حیرت‌انگیز واقعات کے بعد جو پیش آتے رہے تھے۔ بڑے بوڑھے اس جگہ کی طرف دیکھنے لگے جہاں عشورعلی اپنے کمزور، کانپتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا۔ ان کے سامنے ایک عمودی چٹانی ڈھلان واقع تھی جس کے اوپر میدان مرتفع میں شاہ بلوط کے زرد پڑتے ہوئے درختوں کے درمیان، نئے قصبے دبکی کے، جو کوہساروں میں تعمیراتی کارکنوں کا پہلا قصبہ تھا، شاندار مکانات نظر آ رہے تھے۔

"ارے بھئی کہاں؟ کہاں؟" سب لوگ اپنی آنکھوں پر زور دینے لگے۔

"وہ۔ وہ وہاں، وہ جو آدمی چٹان پر آہنی ڈھانچہ جڑ رہا ہے نا، اس کے تقریباً دو سو میٹر بائیں جانب، جہاں پر عقاب کا نشیمن ہے۔"

"اچھا، مگر وہاں ہے کیا؟"

"ہے کیا؟ ارے، ذرا آنکھیں مل کے ٹھیک سے دیکھو نا!"

"کوئی چڑیا معلوم ہوتی ہے۔"

"مگر کون سی چڑیا؟"

"عقاب ہے نا؟"

"خوب رہی، یہ عقاب کیسے ہو سکتا ہے؟" عشورعلی بڑبڑایا۔

"لیکن بھئی، عقاب کے نشیمن میں کسی عقاب کے سوا اور ہو ہی کون سکتا ہے؟" دنگیر – دنگارچو نے حیرت ظاہر کی۔

ہونہہ، عشورعلی بھی ان لوگوں کو کہاں لے آیا؟

"تم جانا کہاں چاہتے ہو؟ کہیں پروجیکٹ پر تو نہیں؟"

گھنٹہ بھر قبل دنگیر – دنگارچو نے اس سے پوچھا تھا۔ جہاں تک اس کو معلوم تھا اس کے دوست نے تعمیرات میں اس سے قبل کبھی بھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"ھاں، لیکن گھاٹی کی اس طرف سے ھو کر۔ میں تم کو ایک حیرت‌انگیز چیز دکھانا چاھتا ھوں۔"

"میں وھاں کی ھر چیز خوب دیکھ چکا ھوں، ھر چیز کے کمال پر متعجب بھی ھو چکا ھوں۔"

"نہیں نہیں، میں تمھیں جو کچھ دکھانا چاھتا ھوں اسے تم نے نہیں دیکھا۔ ارے بھئی سنو، تم لوگوں میں کسی کے پاس دوربین ھو تو لے آؤ۔ اور ھاں سنو، کچھ اور بھی لیتے آنا..." لوگ سمجھ گئے کہ "کچھ اور بھی" سے اس کی کیا مراد ھے۔

تو اس طرح عشورعلی اور دنگیر – دنگارچو آگے آگے چلے۔ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ھو لئے جو اس وقت مصروف نہیں تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے خیال کیا کہ بڑے بوڑھے چٹانوں کی اس چوٹی تک چڑھ کے جانا چاھتے ھیں جہاں سے انھیں دامن کوہ اور نشیب میں واقع چیر – یورت سمندر تک دکھائی دے جائے، جہاں سولاک دریا اپنا راستہ روکنے والی چٹانوں کو توڑ کے آزادانہ بہہ نکلتا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ معمر بزرگوں نے تمام پریشانیوں کے بعد غالباً آرام کرنے کا فیصلہ کیا ھے۔ راستے میں وہ لوگ کچھ خریدنے دوکان گئے تاکہ خالی ھاتھ نہ جائیں۔ گاؤں سوویت کا سکریٹری ابالا عبدالعرشی جو ساتھ ساتھ چل رھا تھا، ایک دوربین لے آیا۔

"عقاب تو ان علاقوں کو جانے کب ھی چھوڑ کے جا چکے ھیں" عشورعلی نے اب ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "ذرا اچھی طرح دیکھو... یا میں یہ سمجھوں کہ اتنے اندھے ھو گئے ھو کہ سفید و سیاہ میں تمیز نہیں کر سکتے؟"

"جی ھاں، آپ ٹھیک کہتے ھیں، وہ عقاب نہیں ھے" ابالا عبدالعرشی نے دوربین سے دیکھتے ھوئے کہا۔ "عقاب سے چھوٹی کوئی چیز ھے اور رنگ... ارے، وہ تو ایک سفید چڑیا ھے۔"

"سفید تو ھے مگر کون سی چڑیا ھے؟"

"ایسا ھو ھی نہیں سکتا!" دنگیر – دنگارچو نے قیاس لگانے اور

یقین نہ کرنے کے انداز میں کہا اور تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ھوئے دوربین گاؤں سوویت کے سکریٹری کے ھاتھوں سے چھین کے آنکھوں کے سامنے کی۔ "ناممکن!.."

"یہی میں نے بھی سوچا تھا" عشورعلی نے دھیرے سے بیٹھتے ھوئے کہا۔

"لیکن یہاں، ھمارے کوھساروں میں..."

"ارے بھئی، کون سی چڑیا ھے جس نے تمھیں اتنا زیادہ متعجب کر دیا؟"

"مرغابی۔"

"مرغابی؟"

"کیسی مرغابی؟ یہاں کہاں سے آ گئی؟"

"ذرا دوربین مجھے تو دینا، میں بھی تو دیکھوں!"

"عقاب کے نشیمن میں ایک سفید چڑیا بیٹھی ھے۔"

"ھاں، عقاب کے نشیمن میں ایک مرغابی۔"

"ذرا سنو تو اس چڑیا کی آواز کیسی زوردار ھے" عشورعلی نے کہا اور اپنا خالی گلاس امیرخان کی طرف بڑھایا۔ "لاؤ، مجھے تھوڑی سی شراب تو انڈیل دو!"

خاموشی سے لوگ ایک دوسرے کو دوربین تھماتے گئے اور ھر ایک نے باری باری اس عجیب چیز کو جس کا ان علاقوں میں آنا غیرمعمولی بات تھی، حیرت کے ساتھ دیکھا۔ اس سے قبل کبھی بھی کوئی مرغابی ان علاقوں میں نہیں دیکھی گئی تھی اور صدیوں سے لوگوں نے صرف عقاب کی بےجان اور شاذ و نادر ھی سنائی دینے والی پکار ھی سنی تھی۔ ڈھلوان چٹان کی ناقابل رسائی خالی جگھوں میں صرف عقابوں نے اپنے نشیمن بنائے اور وحشی مکھیوں نے شہد کے چھتے لگائے تھے۔ اب یہ سفید چڑیا چیکا – سیزل – میئر کوھساروں میں کسی نئی چیز کی پیامی بن کے آئی تھی اور عقاب کے نشیمن میں بیٹھ جانے کے بعد ان لوگوں سے کہہ رھی تھی کہ اس کی آمد کا مطلب یہ ھے کہ گھاٹی میں یقیناً ایک سمندر وجود میں آنے والا ھے۔ سب لوگ خاموشی کے ساتھ کھانا کھانے لگے۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس خبر سے دنگیر – دنگارچو اتنا زیادہ متاثر ھوگا۔ اس نے لوگوں کی نظریں بچا کے ایک آنسو جسے وہ

ضبط نہیں کر سکا تھا، پونچھ ڈالا اور گرد سے اٹی ہوئی کسی سڑک کے کنارے واقع بلیک بیری جھاڑی کی طرح زرد اور نڈھال ہو کے بیٹھا رہا۔ اچانک ان سب پر اداسی طاری ہو گئی۔

اتنے میں وہ مرغابی نشیمن سے اڑ کے کسی طرف چل دی۔ سفید، لمبے بازو والی چڑیا، تم چیر - یورت سمندر سے اڑ کے آئیں اور معمر کہستانیوں کے دلوں کو مضطرب کر دیا۔

ایک مرغابی، ایک سفید چڑیا چیکا - سیزل -میئر کوھساروں میں۔

"دن بخیر بزرگو۔ ایسا لگتا ھے کہ کسی چیز نے آپ لوگوں کو متحیر کر دیا ھے؟" چٹانوں میں آھنی ڈھانچے جڑنے والے ایک کارکن نے جو جسم میں چوڑے پٹے سے بندھی ہوئی آھنی رسی کے سہارے گھاٹی سے چڑھ کے ان لوگوں تک پہنچا تھا، کہا۔ "حیرت میں نہ پڑیئے یہ تو اچھی چڑیا ھے۔ مرغابی تو نئے دور کا پیغام لاتی ھے۔"

"ارے جوان آدمی، تم تو بڑی باتیں کرتے ہو۔ اپنے سلام کا جواب دینے کا بھی ہمیں موقع نہیں دیتے" عشورعلی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "اچھا لو، نئے دور کے پیامی کے نام پر ایک جام انڈیلو۔"

"شکریہ، میں نہیں پیتا" اس نے جواب دیا پھر خود اتار کے سینے کی جیب میں رکھے ہوئے رومال سے منہ پونچھا۔

"بالکل نہیں پیتے؟"

"جی نہیں۔ کام ہی ایسا ھے۔ لیکن معاف کیجئےگا میں آپ کی باتوں میں مخل ہوا۔ کوئی ایسی بات ھے کیا جو آپ لوگوں کو پسند نہیں آ رہی ھے؟ آپ لوگ چرکیئی کے رہنے والے ہیں نا؟" اس نے ہلکی رسی کو لپیٹ لیا۔

"دیکھو، بہت ہوشیار نوجوان ھے۔ ہم پر صرف ایک نگاہ ڈال کے ہی سمجھ گیا کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں" امیرخان نے عشورعلی جیسے تند لہجے ہی میں جھنجھلاہٹ سے کہا۔ "تم کو بہت کچھ معلوم ھے تو ذرا یہ تو بتاؤ کہ یہ سب اچھا ھے یا برا؟"

غیردوستانہ لہجے اور طنزیہ فقروں کا اس شخص پر خاصا اثر ہوا۔ وہ خوش‌اخلاقی سے پیش آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بڑے بوڑھے اس سے یوں مخاطب تھے جیسے اس نے ان کے محبوب کتے

کو مار ڈالا ہو۔ چنانچہ اس بار وہ انہیں خوف‌زدہ کرنے والے انداز سے بولا:

"ہو سکتا ھے کہ برا ہی ہو، اگر آپ لوگ بہت تیزی کے ساتھ یہاں سے کسی محفوظ جگہ کو نہیں چلے جاتے۔ کم سے کم وہاں چلے جائیں تو اچھا رہےگا" اور اس نے خاصی دوری پر واقع ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم لوگ ڈائنامائیٹ سے چٹانیں اڑانے کا سلسلہ شروع کرنے جا رہے ہیں۔"

"ارے، بڑے بوڑھوں کی باتوں کا برا نہ مانو" ابالا عبدالعرشی نے ناخوشگوار فضا کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اور کہو، کام کیسا چل رہا ھے؟"

"بڑا شاندار ھے! بڑی خوشی کی بات ھے! معاف کیجئےگا کہ آپ کی باتوں میں مخل ہوا" اس نے عبدالعرشی کا شانہ مفاہمتی انداز میں تھپتھپایا۔ "یہاں سے کافی دور چلے جائیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پتھروں کے ٹکڑے اڑ کے وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے۔"

وہ لوگ کھڑے ہو کے وہاں سے روانہ ہی ہونے کو تھے کہ انہوں نے اس اجنبی چڑیا کی زوردار چیخ ایک بار پھر سنی۔ اس کے بعد انہیں سائرن کی ایک طویل چیخ سنائی دی جو لوگوں کو محفوظ جگہوں پر پہنچ جانے کی آگاہی دے رہی تھی۔ یہ آخری آگاہی تھی۔

چھٹا باب

جس میں بتایا گیا ھے کہ انسان کی زندگی دوسرے لوگوں کے درمیان کس طرح پیچیدہ لیکن ان کے بغیر بالکل بےمعنی ہو کے رہ جاتی ھے۔

فتح کی مسرت ایک نغمہ ھے

تو اب ہم اپنے قصے کے آخری باب پر آ گئے۔

حیات انسانی میں ہر دن اپنا ایک مخصوص رنگ رکھتا ھے حالانکہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر ہفتے میں دوشنبہ، مثال کے طور پر سفید اور جمعہ سرخ ہوگا۔ زندگی میں یکساں ایام نہیں ہوا کرتے اور آسمان پر آفتاب ہمیشہ روشن نہیں رہتا۔ زیادہ نپے تلے انداز

میں یوں کہنا چاہئے کہ آفتاب موجود تو رہتا ہے لیکن ہمارے اوپر اپنی مسکراہٹ ہمیشہ نہیں بکھیرتا۔ زندگی دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کی شکل میں ترتیب دی جاتی ہے حالانکہ ہمارے اس زمانے میں زندگی کو ناپنے کے لئے دوسرے معیار تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ داخلی خوبیاں یا دوسری اقدار، مگر یہ چیزیں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ وقت... کیا وقت کا کوئی آغاز بھی تھا اور کیا اس کا کوئی اختتام بھی ہوگا؟ کوئی آغاز تھا تو کوئی اختتام بھی ہونا چاہئے نا۔ لیکن جو کچھ ناقابل فہم ہے اس کے جنگل میں ہمیں بہت زیادہ چھان بین نہ کرنی چاہئے۔

امیرخان نے جب مختدر مرحوم سے کچھ وقت کے لئے اس کی کلہاڑی مانگی تھی تو مختدر نے کہا تھا: "وقت – تم جو بھی چاہو لے لو لیکن میں اپنی کلہاڑی تمہارے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔" ہاں، وقت کلہاڑی نہیں ہے، یہ ایک ہی جگہ پڑا نہیں رہتا۔

وقت کو بگاڑا اور خراب نہیں کیا جا سکتا۔

وقت کبھی سفید اور کبھی سیاہ گھوڑے پر زین سے بندھے ہوئے اپنے تھیلے میں اپنی مسرتیں اور غم و آلام رکھے ہوئے سرپٹ دوڑتا رہتا ہے۔ دنگیر – دنگارچو دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اس اثنا میں اس کی قبر پر دو بار گھاس اگ چکی تھی۔ صرف موت ہی ترجیحات کی ہر ترتیب کو نظرانداز کر دیتی ہے۔ عشورعلی بھلا کبھی سوچ سکتا تھا کہ وہ دنگیر – دنگارچو سے زیادہ دنوں تک زندہ رہےگا اور اسے قدیم قبرستان میں دفن کرےگا؟ اب تو اس کی قبر پر جنگلی گھاس دو بار اگ چکی تھی۔ الوداع دنگیر – دنگارچو۔ گدےکن میں اکٹھا ہونے والوں کی تعداد اور بھی کم ہو گئی تھی اور کچھ زیادہ ہی جگہیں خالی ہو چکی تھیں۔ پھر بھی بڑے بوڑھوں کے دلوں میں سلطنت یا پارٹی سکریٹری سے یہ دریافت کرنے کا کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ نئے چرکیئی میں گدےکن کے لئے کوئی گنجائش کیوں نہیں رکھی گئی ہے اور تعمیراتی کارکنوں نے اسے اپنے منصوبوں میں کیوں نہیں شامل کیا ہے۔ وہ اب بھی یہ سوال پوچھ سکتے تھے کیونکہ اور کچھ نہیں تو خامی نکالنے کے لئے ہی کوئی نہ کوئی بات دریافت کی جا سکتی تھی۔ دراصل خود کو نئے طور طریقوں کا عادی کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ بات نوجوان

افراد کے لئے بھی مشکل ہوتی ہے جو بہت کچھ دیکھ اور جھیل چکے ہیں۔ ہاں حیرت نہ کیجئے، ہمارے زمانے میں سب کچھ دیکھنے، جھیلنے اور تجربات حاصل کرنے والے بڑے بوڑھے نہیں، نوجوان افراد ہی ہیں۔ زمانے کی بھی کیا کیا الٹی باتیں ہیں۔

"وہ لوگ نئے چرکیئی کی تعمیر مکمل کرنے کو ہیں۔ ہیں نا؟"

"کیا وہ زلزلے کو بھول گئے ہیں؟"

"نہیں، انہوں نے اسے فراموش نہیں کیا۔ ہر بات کو ذہن میں رکھا ہے۔"

اتنا زیادہ وقت گزر جانے کے باوجود بھاری ٹرکوں کے چلتے وقت زمین ہلتی تو کچھ لوگ اب بھی خوف‌زدہ ہو جاتے تھے۔ اب بھی وہ راتوں کو جاگ جاتے اور دوڑتے ہوئے باہر برآمدے میں آ کے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر تلاش کرنے لگتے جسے وہ وہاں چھوڑ گئے تھے۔ لیکن جیسا کہ روسی کہاوت ہے، ہر مصیبت میں تسلی کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے۔ اس زبردست تباہی و بربادی کے بعد داغستان کی کایا پلٹ ہو گئی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ داغستان کو بہت سے نئے دوست مل گئے اور داغستان کی اعلا سوویت نے نہایت ہی گرمجوشی سے دی جانے والی امداد اور نیکی کے سلسلے میں بہت سے انعامات اور اعزازات کی منظوری دی۔ یہی وجہ تھی کہ کہستانی افراد اس قدیم کہاوت کو اکثر یاد کیا کرتے تھے: "کبھی بھی کوئی ایسا مکان نہ ہو جس میں دھلیز نہ پائی جاتی ہو، کبھی بھی کوئی ایسی دھلیز نہ ہو جسے دوستوں کے قدموں نے پار نہ کیا ہو۔ معزز شخص وہ نہیں ہوتا جس کا مکان بہت عمدہ ہو بلکہ وہ ہوتا ہے جس کے مکان کی دھلیز دوستوں کے قدموں سے گھس گئی ہو۔"

ذرا بھائیچارے کے نغمے کو تو سنیے:

"ارے سنو، وہ لینن‌گراد کا اندریئی تمہیں یاد ہے نا؟ اس نے ایک داغستانی لڑکی سے شادی کر لی۔ امیرخان کی بھتیجی سے۔"

"تم نے سنا، پیوتر کے بیٹا پیدا ہوا ہے۔ ہمیں اسے مبارک‌باد دینی ہے!"

"سنو تو آج ایک شادی ہو رہی ہے۔ ہمارا زبیر ایک چوواش*

* سوویت یونین کی ایک قوم۔ اڈیٹر۔

لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ اور لڑکی بھی کیا شاندار ہے! چاند جیسا چہرہ، چاند جیسا دل اور خود آفتاب درخشاں جیسی۔ تم اسے جانتے ہو، کیوں، کیا یاد نہیں آ رہی ہے؟ ارے بھئی، وہی لڑکی جو طالب علموں کی ثقافتی شام میں طائر خوش الحاں کی طرح نغمہ‌سرا ہوئی تھی!"

"دیکھو، ذرا مدد کرو۔ ایک نئے بیاہے جوڑے کے لئے مکان چاہئے۔ ہمارا سائبیریا کا رہنے والا دوست یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ کون؟ پوچھ کیوں رہے ہو، تم اسے نہیں جانتے کیا؟ ارے وہی ابراہیم! سائبیریا کا رہنے والا اور نام ابراہیم؟ ہاں ہاں، سائبیریا کا۔ وہ وہیں پیدا ہوا، بڑھا پلا اور وہیں اس نے لوگوں کو پہچاننا سیکھا۔"

"سنو، ہمارے بچے تعطیلات میں ماسکو بورڈنگ اسکول سے گھر آ رہے ہیں۔"

"سنو، ان لوگوں نے ایک نئی بستی تعمیر کی ہے، ہمیں اس کے لئے کوئی نام تلاش کرنا ہے۔ پرانے نام پرانی جگہوں کے لئے موزوں ہیں لیکن نئی زندگی نئے ستارے کے سائے میں شروع ہونی چاہئے۔"

"بہتر ہوگا کہ پرانے نام برقرار رکھے جائیں اور ان میں لفظ "نیا" جوڑ دیا جائے۔ کسی یادگار کے طور پر، آنے والی نسلوں کے لئے تاکید کی حیثیت سے۔ ذرا غور کرو، یہ نام سننے میں کیسے لگتے ہیں: نیا زبوتل، نیا ایکی بولاق، نیا کرانائی، نیا ارگانائی، نیا کپ‌چغائی، نیا شمخل بولاق، نیا ککایورت، نیا قم‌تورقلعہ، نیا اچکنت، نیا چرکیئی..."

"اس کہاوت کو یاد رکھو جو بہت اچھی اور سمجھداری کی کہاوت ہے: "سال بھر آگے کی بات سوچنے والا گیہوں بوتا ہے، مستقبل کا خیال کرنے والے کو نوجوانوں کی فکر کرنی چاہئے۔" تم اسے جانتے ہو؟ اچھا تو ہمیں کھیل کود کا مرکز قائم کرنا چاہئے۔"

"سنو، مجھے تمغہ عطا کیا گیا ہے اور تم مبارک‌باد دینے تک نہیں آئے!"

"مجھے بھی تمغہ عطا کیا جا رہا تھا اسی وجہ سے نہ آ سکا۔ تم مجھے معاف کر دو، میں تم کو معاف کر دوں گا۔"

"ارے سنو، ستمبر آ رہا ہے، اسکول کی تعمیر کو مکمل کرنا ہے۔"

"لو یہ اور سنو، ان تاشقند والوں نے ہماری زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ سنا ہے تم نے؟ یہ تو بحیرہ کیسپین کی دوسری طرف کے فاتحین ٹھہرے۔ بالکل ہمارے دارالخلافے میں ان لوگوں نے پورا ایک رہائشی علاقہ تعمیر کر دیا ہے جو مجموعی طور پر ٢٣ ہزار مربع میٹر رہائشی جگہ پر مشتمل ہے۔ ان لوگوں نے اس علاقے کو اپنے مخصوص طرز تعمیر سے، اپنے گل‌بوٹوں سے بنایا سجایا ہے اور نام رکھا ہے "ازبیکستان"۔ ٹیکسی کرو، ڈرائیور پوچھے گا: "کہاں جانا ہے؟" جواب دو: "ازبیکستان۔" دیکھو تو ازبیکستان کتنا قریب آ گیا ہے۔ ٹرالی‌بس سے صرف چھ اسٹاپ کا فاصلہ۔ "بھئی، اپنے نئے مکان کے سلسلے میں مبارک‌باد قبول کرو، کس علاقے میں ہے؟" "ازبیکستان میں۔" "تم کہاں رہتے ہو؟" "ازبیکستان میں۔" "سالگرہ کی پارٹی کے لئے ہمیں کسی رستوراں میں چلنا چاہئے۔" "بہترین جگہ کہاں ہے؟" "یقیناً "ازبیکستان!"

"دیکھو بھئی، ہم لوگوں کو "لینن‌گراد" چلنا چاہئے۔ پیدل بےشک، پانچ منٹ کا تو راستہ ہی ہے۔ کھانا وہیں کھائیں گے۔ اچھا ہوٹل ہے، ١٦ منزلہ اور چار رستوراں۔ کھانا بہت ہی شاندار ہوتا ہے۔"

"سنو، شام کو ہم لوگ "تولا" کیفے میں ملیں گے۔ مجھے ایک دلچسپ مسئلے پر تبادلہ خیال کرنا ہے۔"

"ذرا سوچو تو ہمیں آخر ملا کیا؟ "ازبیکستان" ہے، "تولا" ہے، "لینن‌گراد" ہے، "تبلیسی" ہے اور "یوکرین" ہے، مگر "داغستان" کہاں ہے؟"

"ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنا داغستان زیادہ سے زیادہ پسند آتا جا رہا ہے۔ جاننا چاہتے ہو کہ کیوں؟ بتاتا ہوں: میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے داغستان کے اتنی کثیر تعداد میں اچھے دوست ہیں۔"

تم اپنے بھائیوں کے حلقے میں صدیوں صدیوں تک یونہی برقرار رہو! تم بہت شاندار ہو، داغستان کیونکہ تمہارے دوست بہت شاندار ہیں۔ ہماری یونین زندہ‌باد! آفتاب زندہ‌باد!

کیا یہ ایک نغمہ نہیں ہے؟ کیا یہ قدرت کی طاقتوں پر انسان کی فتح نہیں ہے؟ ہمارے عہد کو اکثر آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جب تک ہمارے اندر بھائی‌چارے کے جذبات برقرار ہیں کوئی بھی چیز مہیب نہیں۔ آزمائشیں زندگی کو کچھ اور تابندہ ہی کر دیں گی۔

آدمی زندگی میں واپس آنا چاہتا ہے

جی ہاں، زندگی اس وقت خوبصورت ہوتی ہے جب آفتاب چمک رہا ہو، آدمی کا موڈ اچھا ہو اور دل پر کوئی بار نہ ہو۔ لیکن انسان بھلا اس وقت کیا کر سکتا ہے جب آفتاب باعث مسرت نہ ہو، جب دل پر سو طرح کے بوجھ ہوں، موڈ اداس ہو اور ذہن مایوسی سے سیسے جیسا ہو گیا ہو؟ حسریت ایسے میں کیا کر سکتا تھا جب اس کے لئے ساری تدبیریں الٹی ہو کے رہ گئی تھیں؟ کبھی اس کے حالات اتنے اچھے تھے کہ ہر شخص رشک کرتا تھا لیکن اب تو سب کچھ مٹ چکا تھا، بگڑ چکا تھا، کامرانی اور قسمت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور کوئی مسرت نصیب نہ تھی۔ اس کی آنکھیں شدت غم سے دکھنے اور جلنے لگتی تھیں اور ماضی کی یادیں لہروں کی شکل میں اس کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ کتنا خوش اور مطمئن تھا ان دنوں وہ بھی جبکہ کہاوت کے بموجب وقت کی لگام اس کے ہاتھوں میں تھی اور وہ رکاب پر مضبوطی سے پاؤں جمائے ہوئے زندگی پر سواری کر رہا تھا... لیکن اب؟ اب وہ کیا تھا؟ اس کی حیثیت اب اس شخص کی سی تھی جسے ایسے گھوڑے نے جس کے نعل نہ جڑے ہوں بیچ راستے میں زمین پر پٹک دیا ہو۔ اس کے پرانے دوست اس کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھتے بھی نہیں تھے اور دیکھتے بھی تھے تو محض پرحقارت ترس کے ساتھ۔ عملے کے شعبے کا سربراہ، وہی مکرو جو اس کی چاپلوسی کیا کرتا تھا اور کسی دوست کو ملازمت دلانے کے سلسلے میں اس کی مدد حاصل کیا کرتا تھا، اب اس کی طرف اپنی سیاہ عینک کے پیچھے سے بڑے سرپرستانہ انداز میں دیکھتا تھا۔ وہ لوگ جن کے متعلق اس نے کبھی کوئی خاص سخت قسم کے مذاق نہیں کئے تھے وہ اب اس کے متعلق پوری کینہ‌پروری کے ساتھ مذاق

کرتے تھے۔ جن لوگوں کی اس نے کچھ مدد کی تھی وہ اس کے بارے میں اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے وہ کسی کام کا نہ رہ گیا ہو، مر چکا ہو۔ اور اس کے دشمن... وہ تو خیر بغلیں بجا ہی رہے تھے۔ کوئی شخص بھلا ان لوگوں کو کیسے دکھا سکتا تھا کہ حسریت شارویلی اب بھی زندہ ہے اور وہ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرے گا!

زندگی بڑی دشوار چیز کا نام ہے، انتہائی دشوار چیز کا! کوئی شخص راستے پر گر گیا ہو اور اٹھ کے کھڑا ہونا چاہتا ہو تو آخر اسے ہاتھ کا سہارا کیوں نہ دیا جائے، کیوں نہ اس کی مدد کی جائے تاکہ وہ پھر پہلے جیسا ہو جائے؟ نہیں، انسان کو اپنی مدد خود ہی کرنی ہوتی ہے۔ گھوڑا تک ٹھوکر کھا سکتا ہے جو چار پیروں پر چلتا ہے لیکن ٹھوکر کھا کے گرنے کا مطلب زمین پر پڑے پڑے سڑنا تو نہیں ہوا کرتا۔ قطعاً نہیں۔

"مجھے بہت افسوس ہے لیکن کیا کروں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا" حسریت شارویلی کو یہی سننے کو ملتا تھا۔

یہ ایک ناقابل برداشت صورت‌حال تھی۔ وہ اس سے زیادہ سردمہری، سنگدلانہ بےاعتنائی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ اس کے وہی ساتھی جو اس کی تعریفوں کے پل باندھنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے، جو فخر کے ساتھ کہتے تھے: "یہ میرا دوست ہے"، اب اسے مزدوروں کے ہاسٹل میں ٹھہرنے کی جگہ بھی نہیں دینا چاہتے تھے! وہ ایک علاحدہ کمرہ چاہتا تھا لیکن اس سے کہا گیا: کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ مشترکہ کمرے میں ایک پلنگ چاہو تو وہ تمہیں مل سکتا ہے۔ اس صورت‌حال میں وہ کر ہی کیا سکتا تھا؟ اس کی بیوی سلطنت اسے اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتی تھی اور اسے کہیں نہ کہیں تو رہنا ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید کسی نہ کسی طرح حالات کچھ ٹھیک ہی ہو جائیں اور وہ تعمیراتی پروجیکٹ پر کوئی کام حاصل کرنے کے سلسلے میں مکرو کے پاس گیا۔

مکرو خود کو لئے دئے رہنے اور باتوں کو چھپانے والا آدمی تھا۔ دل کی بات کو فوراً منہ پر لانا تو جانتا ہی نہیں تھا بلکہ دل میں

جو کچھ ہوتا اس کے برعکس ہی کہتا۔ شبنم کے بارے میں سوچ رہا ہوتا تو مسکرا مسکرا کے برف کے متعلق باتیں کرتا۔

"کوئی ایسی جگہ ہئی نہیں جو تمہارے لئے موزوں ہو۔"

"کسی قسم کا کوئی کام ہی نہیں؟"

"مزدوروں کی جگہیں ضرور خالی ہیں۔ ہمیں ہنرمند مزدوروں کی ضرورت ہے۔"

"تو پھر اسے بھر دو!"

"کیا بھر دوں؟"

"فارم یا آرڈر یا جو بھی کاغذات تمہیں بھرنا ہوتے ہیں" حسریت نے کہا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا مگر دوسرے ہی لمحے گھبراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کنکریٹ ملانے والی مشین پر کام کرنے والا مزدور۔"

"جہنم میں شیطان کے ساتھ بھی اگر چاہو تو کام پر لگا دو!"

حسریت اس دفتر سے جہاں اس کا دم گھٹ رہا تھا قمیض کا کالر کھولتا ہوا جلدی سے باہر نکل آیا۔ اس نے سوچا: کیوں نہ یہاں سے چلا ہی جاؤں، سب کچھ ترک کر کے چلتا بنوں۔ لیکن کہاں؟ کہیں ایسی جگہ جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس کے اندر اس اقدام کی جرأت ہی کہاں ہے۔ بھلا وہ ہر اس چیز سے جو اسے عزیز رہی ہے، رشتہ توڑ کے کہیں اور کیسے جا سکتا ہے؟ ان میں جو سب سے عزیزترین ہے اور جس کی وہ قدر نہیں کر سکا تھا اس سے کیسے دور چلا جائے؟ لیکن سلطنت... کیا وہ کبھی؟ ہونہہ، اسے بھی اپنے اوپر کتنا زیادہ بھروسہ تھا کہ اس نے سلطنت کو عزیز نہ رکھا۔ دراصل اسے اپنے اوپر ناز تھا، وہ اپنی ذات اور اپنی مسرت کے متعلق بہت زیادہ پراعتماد تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید اسے سلطنت سے صحیح معنوں میں محبت نہ تھی، شاید وہ اس دوسری عورت سے محبت کرتا تھا جو جا چکی تھی جس نے اس کو اس طرح ٹھکرا دیا تھا جس طرح کوئی جوان گھوڑی نعل کو جس کی وہ عادی نہ ہو، اپنے سم سے جھڑک کے گرا دے۔ شاید وہ اپنے سوا کسی سے بھی صحیح معنوں میں محبت نہیں کرتا تھا۔

شاید وہ جذبہ جو اس وقت اس پر طاری تھا، مجروح انا کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا؟

حسریت کے لئے خود اپنے خیالات کو، خود اپنے جذبات کو سمجھنا دشوار ثابت ہو رہا تھا، سخت دشوار۔

غداری

نیا چرکیئی مستقبل کے سمندر کے کنارے بن کے تیار ہو گیا۔ اینٹوں پتھروں سے بنا ہوا یہ قصبہ قدیم گاؤں کی طرح بھورا بھورا نہیں بلکہ نہایت ہی خوشوضع اور خوشگوار تھا۔ عمارتیں ایک نئے ڈیزائن سے بنائی گئی تھیں اور دیواروں میں زلزلے سے متعلق ایسی بیلٹ بنی ہوئی تھیں جو انہیں زلزلے کے طاقتور جھٹکوں کے وقت بھی پائیدار رکھنے والی تھیں۔ وسط میں ثانوی اسکول کی ایک خوبصورت عمارت بھی بن گئی تھی اور دوکانیں کھل چکی تھیں۔ قدیم گاؤں کی دوکانوں کو مختلف اشیا کی فراہمی میں بہت کمی کر دی گئی تھی حالانکہ یہ بات بڑے بوڑھوں کو بہت ناگوار گزر رہی تھی۔ کچھ لوگ نئے گاؤں کو منتقل بھی ہو چکے تھے۔ تعمیرات کا سلسلہ ترک کر دئے جانے سے متعلق ساری امیدوں پر پانی پھر چکا تھا اور قدرت کی قوتوں کے خلاف انسان اپنی جد و جہد میں غیرمساوی ہونے کے باوجود فتحیاب ہو گیا تھا۔ جو لوگ اب بھی قدیم چرکیئی میں مقیم تھے ان سے کسی بھی دن اپنا سامان سمیٹ کے کسی ٹرک پر لادنے کو کہا جا سکتا تھا۔ بعض افراد کے لئے یقیناً یہ بڑی دشوار بات تھی لیکن جلد ہی انہیں اپنی قدیم دنیا پر جس کے وہ سالہا سال سے عادی تھے، آخری نگاہ ڈالنی تھی۔ بڑے بوڑھوں کو البتہ آخری دم تک اپنے قدیم مکانوں سے چمٹے رہنا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ ہی ماضی‌پرست ہوتے ہیں۔

لیکن آج گدےکن میں کیا ہو رہا تھا؟ جوش و خروش بھی غیرمعمولی تھا، لوگوں کی تعداد بھی غیرمعمولی تھی اور وہ عام دستور کے مطابق بیٹھے بھی نہیں تھے بلکہ جس کو جہاں جگہ ملی تھی بیٹھ گیا تھا۔ بڑے بوڑھوں کے علاوہ ایسے نوجوان بھی موجود

تھے جو عام روایات کے بموجب اپنی عمروں کو دوگنا یا تین گنا کرتے تب کہیں جا کے ان مقدس چٹانوں پر بیٹھنے کے مستحق قرار پاتے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ غیرنوشتہ قانون کے محافظین نے جو کچھ ناگزیر تھا اس کے آگے مجبوراً سر تسلیم خم کر دیا تھا؟ بڑے بوڑھے نوجوانوں کے شور و غل کو نظرانداز کر رہے تھے - کیا آپ سفید چڑیا کو زور سے بولنے سے روک سکتے ہیں؟ لیکن جہاں تک خود ان کا تعلق تھا ان کی تیوریاں اب بھی چڑھی ہوئی تھیں اور وہ خود کو بہت لئے دئے اور اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔ یہ سچ تھا کہ ان لوگوں کے درمیان گاؤں سوویت کا سکریٹری ابالا عبدالعرشی اور پارٹی تنظیم کا سکریٹری مصطفے، اس بوڑھے ٹیچر کا بیٹا بھی موجود تھے جس نے گدےکن میں کبھی بھی وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ لیکن ٹیچر کا وہ بیٹا وہاں بیٹھا ہوا تھا اور کسی کے دل میں اس کو مبارکباد دینے کا خیال تک نہیں آ رہا تھا حالانکہ اس روز کے اخبار میں اس کا نام بھی ان لوگوں کے ناموں کے ساتھ شائع ہوا تھا جنہیں زلزلے کی تباہی سے نپٹنے کے سلسلے میں اعزاز دئے گئے تھے۔

"پہلے تو وعدہ کیا گیا تھا کہ قبرستان میں یادگاروں پر شیشے کے گنبد کھڑے کئے جائیں گے، اس تجویز کا آخر کیا ہوا؟" امیرخان نے پوچھا۔

"وہ ساری باتیں فراموش کر دی گئی ہیں" چنتارئی نے جو اپنے داماد کی موجودگی میں کبھی بھی زیادہ کہنا نہیں پسند کرتا تھا، شکایت کی۔

"لیکن کہا کیا جا رہا ہے؟"

"کہا یہ جا رہا ہے کہ جو یادگاریں اعزاز کی مستحق ہیں، انہیں نئی جگہ پر منتقل کر دیا جائے گا۔"

"اعزاز کی مستحق..." عشورعلی نے پائپ کا کش لیتے ہوئے دوہرایا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا خاندان اعزاز کا مستحق ہے، میرا نہیں۔ ہے نا یہی بات؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"معزز عشورعلی، کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ دو گائیں کھونے کو تیار ہیں بشرطیکہ میں ایک سے محروم ہو جاؤں۔ ہے نا یہی بات؟"

"میں کچھ بھی نہیں کہہ رہا ہوں" عشورعلی نے کہا جو چبھتے ہوئے طنزیہ فقرے برداشت کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ اور کر ہی کیا سکتا تھا کیونکہ اب اس میں لوگوں پر مضبوطی سے اپنی دھاک جمائے رکھنے کی طاقت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہاری نگاہیں نئے چرکیئی پر لگی ہوئی ہیں اور تم نے اپنا سامان باندھ لیا ہے۔"

"بھئی، لوگوں کو ویسے ہی وہاں منتقل کر دیا جائے گا۔ تاخیر سے عجلت بہرحال بہتر ہے" امیرخان نے کہا۔ "اچھا عشورعلی، کیا تم یہیں ٹھہرے رہنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اور اس نے عیاری سے مصطفے کو آنکھ ماری۔

"ہاں" عشورعلی نے سختی سے کہا۔ "میں یہاں لیٹ جاؤں گا اور جنبش تک کرنے سے انکار کر دوں گا!" یہ مایوسی کی پکار تھی جو اس کے دل سے نکلی تھی۔

دوسرے بڑے بوڑھے دھیرے دھیرے اس معاملے میں کمزور پڑتے جا رہے تھے اور وہ پہلے تو ہچکچاتے ہوئے اور بعد میں بڑھتی ہوئی جسارت کے ساتھ عشورعلی کے سامنے نئے چرکیئی کو منتقل ہونے پر آمادگی ظاہر کرنے اور ایک نئی زندگی شروع کرنے کی باتیں کرنے لگے تھے۔

"محترم عشورعلی، خود آپ کے بیٹے آپ کو اپنی بانہوں میں اٹھا کے لے جائیں گے" مصطفے نے اس پر یہ واضح کرنے کی خواہش کے تحت کہا کہ اب ساری مخالفت فضول ہو کے رہ گئی ہے۔

"نہیں!"

"لیکن وہ لوگ تو کمیونسٹ ہیں نا؟ ہاں، یقیناً ہیں۔ وہ سوجھ بوجھ اور ضمیر والے مرد ہیں۔"

"ان کی اپنی سوجھ بوجھ ہے اور میری اپنی۔"

"اور ان بیٹوں سے کہا جائے گا کہ وہ آپ سے اس معاملے میں باتیں کریں، آپ کی ضعیفی میں آپ کو سیاسی تربیت دیں" ابالا عبدالعرشی نے مسکراتے ہوئے مصطفے کی تائید کی۔

"ابھی کل کے لڑکے اور تمہیں بھی آواز بلند کرنے کی ہمت پڑ گئی" عشورعلی نے سخت برہمی سے کہا۔ "ٹھیک ہے جاری رکھو، جاری رکھو۔ آج کل تو تم سب لوگ بڑے بوڑھوں کا مذاق اڑا سکتے

ہو۔ زمانہ ہی تمہارا ہے۔ ہماری بےطاقتی تمہاری طاقت جو ٹھہری!"

"آپ بےطاقت تھوڑی ہیں۔ آپ تو بس ضدی ہیں۔"

"کوئی اس کی باتوں پر تو کان دھرے! اور یہ وہ نکما آدمی ہے جسے میں نے سانڈ سے بچایا تھا۔ اس نے اپنی دونوں سینگوں سے اس کے جسم کو پھاڑ کے رکھ دیا ہوتا۔ میں نے اس وقت کبھی سوچا بھی نہیں تھا..."

"اور آپ نے سوچا ہی ہوتا تو کیا ہو گیا ہوتا؟"

"میں نے تمہاری جان بچائی تھی، ناشکرگزار آدمی!"

"معزز عشورعلی، اس سلسلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اب آپ کی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہوں جسے آپ اپنی ضد سے پھاڑ ڈالنے کو تیار ہیں" ابالا عبدالعرشی نے اس طرح بےباکی سے باتیں کرنے کی کبھی بھی ہمت نہ کی ہوتی اگر اسے یہ اندازہ نہ ہو گیا ہوتا کہ بوڑھا اپنی ضد کے معاملے میں بالکل اکیلا ہے اور دوسرے لوگ دل ہی دل میں عشورعلی کے ساتھ نہیں بلکہ خود اس کے ساتھ ہیں۔

"خاموش ہو جاؤ!" عشورعلی چیخ پڑا۔

"بھئی غصہ نہ کرو" لنگڑے عثمان نے کہا۔ "سچ پوچھو تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔"

"اور تم ٹھیک نہیں کہہ رہے ہو، عشورعلی" امیرخان نے کہا۔ "اب تم کچھ بھی کہو، میں نے تو نئی جگہ کو منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اور میں نے بھی!" لنگڑے عثمان نے کہا۔ "ان سب باتوں سے اوب چکا ہوں! میرا آدھا خاندان ویسے بھی وہاں پہنچ چکا ہے۔"

"جاؤ! سب لوگ جاؤ! چاہتے ہو تو جہنم میں چلے جاؤ! کوئی تمہیں روک تھوڑی رہا ہے!" عشورعلی نے اپنا ڈنڈا اپنے سر پر گھمایا۔ اس سے قبل کسی نے کبھی بھی اسے اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

"معزز بزرگو، آخر آپ لوگ ایک دوسرے پر غصے کا اظہار کیوں کریں؟ ظاہر ہے کہ نئے گاؤں میں منتقل ہونے سے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ عشورعلی خود بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے اس کا اعتراف کرنا انہیں بےتکا سا

لگ رہا ہے۔ کتاگن قبیلے کے عشورعلی، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" مصطفےٰ نے جو دفتر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس سے مخاطب ہو کے کہا۔

"نہیں مصطفےٰ، تم ٹھیک نہیں کہہ رہے ہو۔ مجھے کسی بات کا اعتراف نہیں کرنا ہے" عشورعلی نے کہا۔ "میں نے جس طرح اپنی ساری زندگی بسر کی ہے، ویسا ہی اب بھی ہوں اور میرے بدل جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

"امید کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے درمیان خوشگوار تبادلہ خیال ہوگا" پارٹی سکریٹری نے وہاں سے جانے کے لئے مڑتے ہوئے کہا۔

"ہمارا پارٹی سکریٹری صبح ہی سے گدےکن میں کیوں موجود تھا؟ رات کو سو نہیں سکا یا کوئی اور بات ہے؟" امیرخان نے کہا۔ "خاص موقعوں کی پوشاک بھی پہنے ہوئے ہے!"

اب بھی کسی کو یاد نہ آیا کہ مصطفےٰ کو تمغے سے نوازا گیا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان لوگوں نے نہ ریڈیو سنا ہو، نہ اخبار پڑھا ہو اور اس بارے میں سرے سے کچھ جانتے ہی نہ رہے ہوں۔

ابالا عبدالعرشی نے دیکھا کہ کوئی شخص اسے اشارے سے بلا رہا ہے۔ وہ اس اجنبی کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ اخروٹ کے درختوں کے جھنڈ میں ایک آدمی اس کا انتظار کر رہا ہے جس نے اسے فوراً ہی وہاں بلایا ہے۔ اس سوال پر کہ انتظار کرنے والا آخر ہے کون، اس شخص نے کہا: "وہاں پہنچوگے تو خود ہی دیکھ لوگے۔" بےچارے عبدالعرشی کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے، اس نے طرح طرح کی قیاس‌آرائیاں کر ڈالیں اور قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ وہ سلطنت کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ یا شاید سلطنت کے بجائے کسی اور کو وہاں دیکھنا چاہتا تھا۔ دراصل سلطنت یونہی سرسری بات‌چیت کے دوران اکثر اس سے کہتی رہتی تھی کہ وہ اس کے لئے کوئی خوبصورت لڑکی تلاش کر دےگی۔ وہ تیزی کے ساتھ درختوں کے جھنڈ کی طرف جا رہا تھا تو اس نے تصور ہی تصور میں سب کچھ دیکھ لیا: ایک درخت کے نیچے، اسی درخت کے نیچے جس پر سے وہ اپنے بچپن میں اکثر نیچے گر پڑتا تھا، ایک لڑکی اس کی منتظر تھی... اس نے سوچا کہ اس لڑکی کو گلےبانوں کے سربراہ کی بیٹی جیسی، امیرخان کی پوتی جیسی یا لنگڑے عثمان کی

بھتیجی جیسی ہونا چاہئے۔ وہ اس کے پاس پہنچے گا تو وہ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہے گی: "آپ نے بھلا مجھ سے اتنی دیر تک انتظار کیوں کرایا؟ آداب عرض، اچھا، آپ ایسے ہیں؟" اور وہ خود کیا کہے گا؟ ظاہر ہے کہ پہلے تو وہ بھی کہے گا "آداب عرض!" اس کا تصور یونہی آزادی سے گل کھلاتا رہا یہاں تک کہ وہاں پہنچ کے اس نے سائے میں ایک آدمی کو کھڑے پایا جس کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔

"کون ہو، بھئی؟ تمہیں آخر چاہئے کیا؟" اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کے پیٹھ کے پیچھے کرتے ہوئے پوچھا۔ اسے سخت قسم کے مذاقوں کا تجربہ ہو چکا تھا اور ہر صورت‌حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ "ارے تم بہرے ہو گیا؟ یہ میں ہوں، ابالا عبدالعرشی جسے تم نے بلوا بھیجا تھا۔"

"یہاں آؤ" آدمی نے مڑے بغیر کہا۔

"مگر تم ہو کون؟"

"یہ میں ہوں!" اور حسریت نے جو ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونسے ہوئے تھا، مڑ کے اس کا سامنا کیا۔

"کامریڈ حسریت؟ اور میں نے سوچا تھا کہ..." اس نے پتھر دور پھینک دیا، ہاتھ صاف کئے اور دل میں ذرا سا بھی شک لائے بغیر اس کے پاس پہنچا۔ "شام بخیر، کامریڈ حسریت۔"

"دیکھو، میں تمہیں مزہ چکھائے دیتا ہوں" "کامریڈ" حسریت نے کہا اور اس کا گریبان پکڑ کے اتنی آسانی سے قریب کھینچ لیا جیسے وہ کوئی لڑکا ہو۔ "تم ایک مسخرے، ایک کچے بچے، ایک قابل رحم کیڑے... تم..."

"چھوڑو بھی، آخر تم چاہتے کیا ہو؟ میں انسان ہوں، کیڑا نہیں ہوں" عبدالعرشی جو اس اچانک واقعے سے بالکل بھونچکا سا ہو کے رہ گیا تھا، بڑبڑایا۔

"تم ایک کیڑے، بھینگی آنکھ والے، تم اور آفتاب کو دیکھنے کی جسارت کرو؟ تم جانتے ہو کہ آج اس وقت مجھ پر کیا بیتی جب کسی نے اشارتاً کہا کہ میری بدبختی کا سبب تم... تم ہو؟ آخر تمہاری ہمت کیسے پڑی؟.."

"مجھے چھوڑو بھی" عبدالعرشی نے خود کو مضبوط ہاتھوں سے رہا کرانے کی کوشش کی۔ "میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ تم چاہتے کیا ہو؟"

"تم نے اس کو چھوا تھا!"

"تم نشے میں دھت ہو۔ میں جا رہا ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب میں تمہارا بہت معترف تھا، تم پر رشک کرتا تھا لیکن تم محض ایک احمق جانور ہو" اس نے غصے سے جھٹکا دے کر خود کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ "ہاں، اگر جاننا چاہتے ہو تو میں تمہیں بتاتا ہوں، وہ کسی اور شخص سے محبت کرتی ہے۔" اس کا بری طرح جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس شخص کو جو سلطنت کے لئے اتنے زیادہ غم و آلام کا باعث بنا تھا، اذیت پہنچائے، ذلیل کرے۔

"یہ تم نے کیا کہا؟" اچانک حسریت کو وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے کسی کیفے میں اسی روز یوں ہی رواروی میں سنے تھے: "وہ یہاں سے شہر جانے کا منصوبہ بنا رہی ہے جہاں کوئی اس کا چاہنے والا ہے۔"

"ہاں تم نے کیا کہا تھا؟"

"وہی جو تم نے سنا۔"

"وہ کس کی محبت میں مبتلا ہے؟" حسریت نے زور سے چیختے ہوئے عبدالعرشی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے زمین پر پٹک دیا اور بڑی غضبناکی سے اس کا گلا دبانے لگا۔ "جلدی بتاؤ مجھے اس بات پر مجبور نہ کرو کہ تمہیں ہلاک کر دوں، بولو!" یہ کوئی مذاق نہ تھا، حسریت رشک و حسد سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ "آخر وہ کون ہے جس سے وہ محبت کرتی ہے؟"

"عشورعلی کا بیٹا، مراد!"

حسریت نے تیزی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا جیسے اس نے اچانک کسی سانپ کو چھو لیا ہو۔

"اب جا کے اپنی یہ ساری طاقت اس کے اوپر آزماؤ نا!" ابالا عبدالعرشی اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ "میں نے تو کبھی سوچا تک نہ تھا کہ تم ایسے ہو جاؤ گے۔ تمہارے اندر جتنی بھی انسانی قدریں تھیں، تم ان سب کا گلا گھونٹ چکے ہو" اس نے اپنے کپڑوں کو جھاڑ کے برابر کیا اور غصہ بھری نظروں سے حسریت کو دیکھا۔ "بہتر ہوگا کہ تم سیدھے یہاں سے چلے جاؤ، تم سے ہر شخص بیزار ہو چکا ہے۔"

اور عبدالعرشی وہاں سے چلا آیا۔

حسریت سیدھا گدےکن پہنچا جہاں کافی لوگ اکٹھا تھے۔ اس کی

نگاہ عشورعلی پر پڑی جو مسکرا مسکرا کے کچھ بیان کر رہا تھا اور لوگ غور سے سن رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ سیدھا حلقے کے وسط میں جا پہنچا اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد بوڑھے کے پاس گیا۔ اس کی اس حرکت پر ہر شخص چونک پڑا۔ لوگوں نے سوچا کہ آخر حسریت شارویلی کو کیا ہوا ہے جو وہ کسی کو سلام کئے بغیر یوں ہی دندناتا ہوا اندر گھس آیا اور جو بالکل دیوانہ سا نظر آ رہا ہے؟ کیا وہ پھر نشے میں دھت ہے؟

"ارے لوگو، یہ تم کس کی باتیں سن رہے ہو؟" حسریت نے اپنے بازو سر پر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تم کس کی باتوں پر یقین کر رہے ہو؟ اس بوڑھے بکرے کی؟ ذرا اسے اچھی طرح دیکھ تو لو... بکرا ہے بکرا۔ لیکن وہ بکرا نہیں جو گلے کی رہنمائی کرتا ہے بلکہ وہ بکرا جو اپنے سیاہ، بیمار قلب کے ساتھ پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ جس طرح تم لوگ اس کی باتوں پر یقین کر رہے ہو اسی طرح کسی زمانے میں خود میں نے بھی یقین کیا تھا۔ میں نے بھی اس پر اعتماد کیا تھا لیکن اس نے اپنے سموں سے مجھے پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ لوگو، خبردار اس کی باتوں میں نہ آؤ! ذرا اس کی پاپاخا اتار کے اس کے سر کو تو دیکھو۔ تمہیں وہاں جھوٹ اور عیاری کی سینگیں نکلی ہوئی نظر آئیں گی۔"

یہ ایک ایسی بدتمیزی تھی جس کی کوئی دوسری مثال موجود نہ تھی۔ ہر شخص پر جیسے بجلی سی گر پڑی کیونکہ اس طرح کی باتوں کا کسی کہستانی گاؤں میں تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اتنے میں مصطفے وہاں پہنچ گیا جس نے اپنے دفتر کے دریچے سے حسریت کو دیکھا تھا اور اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔ اس نے تیزی سے لپک کے غصے سے پاگل ہو جانے والے اس شخص کو پکڑ لیا جو بوڑھے کے سر سے پاپاخا نوچ پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عشورعلی کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ قصہ کیا ہے۔ اس کی سخت توہین اور بےعزتی کی گئی تھی۔ اس کی ساری زندگی میں کبھی بھی کسی نے اس سے اس ڈھنگ سے باتیں کرنے کی جرأت نہیں کی تھی اور وہ بھی دوسروں کی موجودگی میں۔ اس کا سر شرم سے جھک گیا اور ڈنڈا ہاتھوں سے زمین پر گر پڑا۔

"تمہاری ہمت کیسے پڑی؟ یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" حسریت

کی شدید مزاحمت کے باوجود مصطفے نے اسے ڈھکیل کے لوگوں کے حلقے سے باہر کر دیا۔ حسریت خود کو اس کے مضبوط ہاتھوں سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا اور برابر چیخے جا رہا تھا: "شرم — شرم سے ڈوب مرو عشورعلی!"

"یہاں سے چلے جاؤ، چلے جاؤ! تم پاگل ہو گئے ہو!" حسریت کا غصہ ذرا کچھ کم ہوا تو مصطفے اسے لے کے ایک طرف گیا اور دو نوجوانوں کو بلا کے ان سے کہا: "اسے یہاں سے لے جاؤ، ابھی ابھی لے جاؤ۔" پھر وہ واپس آ کے گدےکن میں عشورعلی کے پاس بیٹھ گیا۔

"وہ بیمار ہے، معزز عشورعلی۔ آپ اس کی باتوں کو اہمیت نہ دیں۔"

"وہ بیمار نہیں ہے، ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے" امیرخان نے کہا۔

"گھر پہنچنے میں میری مدد کیجئے" عشورعلی نے بڑے بوڑھوں سے کہا۔ "میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" امیرخان نے تسلی دینے کے انداز میں اس کا بازو تھام لیا۔

"آخر اس کو ہوا کیا ہے؟" عشورعلی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں تو اس کا صرف بھلا ہی چاہتا ہوں... وہ خوش نہیں ہے، میں ساری باتوں کو سمجھتا ہوں۔ وہ ایک بیمار آدمی ہے لیکن مجھے اس طرح ذلیل کرنا... خیر، اسے بچا لیجئے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ پھر انسان بن جائے، اس کی مدد کیجئے نیک لوگو۔"

وہ ایک طرف سے امیرخان کا اور دوسری طرف سے لنگڑے عثمان کا سہارا لیتا ہوا اپنے گھر کے گیٹ تک آیا جہاں اس نے ان دونوں کو رخصت کر دیا۔ اپنے ڈنڈے پر جسم کا بوجھ سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا احاطے میں داخل ہوا لیکن اندر جانے کے لئے سیڑھیاں نہ طے کر سکا۔ آخر اس نے بیوی زازا کو پکارا جو کمر جھکائے، ہاتھ میں تسبیح لئے باہری برآمدے میں آ گئی۔

"کیا ہوا، میرے سرتاج؟ گھر کے اندر آئیے نا۔"

"میں سیڑھیوں پر چڑھ سکتا تو تمہیں پکارتا ہی کیوں۔"

عشورعلی نے بہ‌دقت دہلیز پار کی، بیوی سے بستر درست کرنے کو کہا اور لیٹ گیا۔

کلید حیات نو

چیکا – سیزل – میٹر کوہسار۔ گھوڑے کے نعل میں کیلوں کے اوپری سروں جیسی پہاڑی چوٹیوں کی ایک زنجیر سی۔ اسی گھوڑے کے نعل جیسے علاقے کے نشیب میں قدیم چرکیئی گاؤں آباد تھا اور پورے علاقے کو "عقاب نشیمن" کہا جاتا تھا۔ پانچ صدیوں سے زائد مدت سے یہ گاؤں اسی جگہ آباد تھا لیکن آج اس کے باسی اس سے رخصت ہو رہے تھے۔ خالی کر دئے جانے والے گھروں کے حیران و ششدر کھلے ہوئے دریچے اداسی سے دیکھ رہے تھے اور ایک خاموش، پتھر جیسا غم دیواروں کے اندر سمایا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باسی؟ وہ تو بہت جوش و خروش میں تھے۔ نئے گھر میں داخلے کے موقعے پر منائی جانے والی تقریب صرف کسی ایک ہی خاندان کی طرف سے نہیں، پورے گاؤں کی طرف سے ہونے والی تھی اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کی کوئی دوسری نظیر موجود نہ تھی۔ بچے ادھر ادھر دوڑتے ہوئے، شور مچاتے ہوئے والدین سے جلدی کرنے کو کہہ رہے تھے۔ ان کے لئے یہ سب کچھ نیا بھی تھا اور بےحد سنسنی‌خیز بھی۔

سلطنت آج ایک شوخ نیلی فراک اور چمکتے ہوئے پیلے لانگ‌بوٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے کانوں کی طلائی بالیوں میں فیروزے کے ننھے ننھے نگ چمک رہے تھے اور بالوں کی چوٹیاں موٹی اور چمکدار تھیں۔ وہ اخروٹ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس کھڑی ہوئی تھی جہاں گاؤں کے لوگ اور ٹرک اکٹھا ہوئے تھے۔ آفتاب گرمجوشی کے ساتھ درخشاں تھا اور فضا میں بہار جیسی تازگی بسی ہوئی تھی۔ اسے گاؤں سوویت کی چیرمین کی حیثیت سے قدیم گاؤں کے لوگوں کو جو اپنا سامان ٹرکوں پر لاد رہے تھے، نئے چرکیئی میں بنے ہوئے نئے مکانوں کی کنجیاں سپرد کرنی تھیں۔

"ہمیں ذرا عجلت برتنی چاہئے۔ ہر گھر کے ساتھ اس کا ایک باغ ہے جس میں کافی زمین ہے۔ اس میں زندگی کی روح پھونکنی ہوگی۔ جوتنا گھودنا اور درخت اور پھولوں کے پودے لگانے ہوں‌گے۔"

"اور گاجر؟"

"گاجر بھی، پیاز اور جی چاہے تو لہسن اور کھیرے بھی۔"

"اور مکا؟"

"یقیناً مکا بھی، اگر کوئی خنکل پر خپلاما* کو ترجیح دیتا ہے۔"

آج ایسا لگتا تھا کہ سلطنت ہمیشہ سے زیادہ لوگوں سے قریب آ گئی تھی اور لوگ اس سے دوستانہ گرمجوشی سے باتیں کر رہے تھے۔

"بیٹی گاؤں سوویت کی چیرمین، ذرا یہ تو بتاؤ کہ وہاں قبرستان ہے کہ نہیں؟" ایک بڑھیا نے پوچھا جس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور جس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"جو چیز نہیں ہے وہ نہیں ہے۔ ابھی وہاں کوئی مرا ہی نہیں۔"

"پانی کا کیا بند و بست ہے؟"

"فی‌الحال پانی کی کچھ کمی ہوگی۔ جب تک ہمارا سمندر وجود میں نہ آئےگا تب تک پانی کو ٹرکوں میں لایا جائےگا۔"

"اور گیس ہوگی کیا؟"

"ضرور ہوگی۔"

"گھروں کو گرم رکھنے کا انتظام؟"

"وہ بھی ہوگا۔"

"جاڑوں کے لئے کیا کنڈیاں نہ بنانی پڑیں گی؟"

"نہیں۔"

"ہر چیز ہے، ہر وہ چیز ہوگی جس سے سہولتیں حاصل ہوں‌گی۔"

"اور لوگ کیا کریں گے؟ کیا لیٹے لیٹے رسالہ پڑھتے رہیں گے؟ یا معمے بھریں گے؟"

"کام کریں گے۔"

"کہاں؟"

"کھیتوں اور باغات میں۔ کہستانی لوگوں کو بھی کبھی کام کی کمی محسوس ہوتی ہے!"

"کھیت اور باغ ہیں کہاں؟ بس خالی زمین پڑی ہوئی ہے۔"

"ارے پانی ہوگا، آبپاشی کی سہولتیں ہوں‌گی اور پھر کھیت اور باغ ہوں‌گے... ترکاریاں اور شیشے سے ڈھکے کھیت۔"

بس یونہی ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ جاری تھا اور مصروف عورتوں کے گروہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق شور و غل مچا رہے

* خنکل، خپلاما – کھانوں کے نام۔ اڈیٹر۔

تھے۔ بوڑھی زازا ان باتوں کو سنتی، ساری بھاگ دوڑ کو دیکھتی اور اپنے علیل شوہر عشورعلی کو تفصیلات بتاتی تھی۔ شوہر کچھ نہ کہتا۔ اسے معلوم تھا کہ دنیا میں وہ چند دنوں کا اور مہمان ہے۔ اس نے بڑی تلخی سے اپنے گاؤں والوں کے بارے میں سوچا: "ان لوگوں کے لئے کچھ بھی مقدس نہیں ہے۔" وہ مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا: "لیکن کسی نہ کسی چیز کو تو مقدس ہونا ہی چاہئے۔ انسان اور ان کی زندگی - بچے اور مستقبل، یہ سب کچھ مقدس ہے۔ آخر اس کے بیٹے کیوں نہیں آئے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اب جبکہ وہ ضعیف اور ناتواں ہو چکا ہے، کسی کو بھی، یہاں تک کہ اس کے بیٹوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں رہی؟" وہ اپنی معمر شریک حیات سے تین بار ان کے متعلق دریافت کر چکا تھا۔ دو بیٹے تو بہت دور مقیم تھے، شاید انہیں تار نہ ملے ہوں لیکن آخر سب سے چھوٹا بیٹا، اس کا سب سے چہیتا مراد کہاں تھا؟ کیا مراد اس واقعے سے برا مان گیا تھا؟ لیکن غصہ ہونے کا اگر کوئی جواز تھا تو اس کے لئے نہیں بلکہ باپ کے لئے تھا۔ عشورعلی کو بعد میں مراد اور سلطنت کی محبت کا پتہ چلا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ حسریت کے طرز عمل کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما تھا۔ لیکن اس کا غصہ کسی بھی نوعیت کا رہا ہو، اس سے اسے ایک معمر شخص کی توہین کرنے کا حق تھوڑی مل سکتا تھا۔ دراصل پہلے جیسے سخت اصول باقی ہی نہیں رہ گئے تھے، کہستانی علاقے میں بڑے بوڑھوں اور نوجوانوں کے رشتوں میں تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ نوجوان زیادہ آزادانہ رویہ اختیار کر سکتے تھے کیونکہ انہیں نسبتاً کہیں زیادہ آزادی حاصل تھی اور شاید یہ سب درست ہی تھا؟ "لیکن سخت اصولوں اور احترام کے جذبات کو برقرار رکھا جانا چاہئے تھا" عشورعلی نے بستر علالت پر لیٹے لیٹے نتیجہ اخذ کیا۔ اسے اس خیال سے سخت نفرت ہو رہی تھی کہ وہ اپنے تمام قدیم پڑوسیوں کے نئے گاؤں کو منتقل کئے جانے کا سماں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے قابل نہیں رہ گیا ہے لیکن اس جذبے کا اعتراف کرنے سے اسے اور بھی زیادہ نفرت محسوس ہوئی۔

"آؤ چلو بڑے بوڑھو، ہم لوگ اپنے عشورعلی کی عیادت کر آئیں۔ اس کے بعد روانگی کے لئے تیار ہو جائیں گے" امیرخان نے

کہا۔ "یہاں اکیلے آخر کیوں ٹھہرا جائے؟ سب لوگ چلے جائیں گے تو گاؤں بہت ہی سرد اور سنسان ہو کے رہ جائے گا۔"

"ارے بوڑھے لوگو، شام کو مویشی وہاں ہنکا لانا!" ایک معمر عورت نے جس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور جو لکڑی کا ایک پالنا پکڑے ہوئے تھی، ٹرک پر سے بیٹھے بیٹھے پکار کے کہا۔

سلطنت نے دو کے سوا تمام گھروں کی کنجیاں لوگوں کو دے دی تھیں۔ ان میں سے ایک کنجی عشورعلی اور زازا کو الاٹ کئے جانے والے گھر کی تھی اور ایک خود اس کے اپنے گھر کی۔ اس نے نئے گھروں میں داخل ہونے کی پرمسرت تقریبات کے متعلق سوچا اور ذرا دیر تک خیالوں میں کھوئی کھوئی سی نئے چرکیئی کی طرف دیکھتی رہی۔ اتنے میں ایک چھوٹی جیپ اخروٹ کے درختوں کے جھنڈ میں آئی اور مراد کود کے نیچے اترا۔ سلطنت کچھ روز قبل اس سے شہر میں رخصت ہوئی تھی اور اب پھر اسے دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ اس نے مراد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مصافحے کے لئے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا چہرہ کچھ دبلا سا معلوم ہو رہا تھا اور ناک اور منہ کے درمیان واضح جھریاں نظر آ رہی تھیں۔ ہونٹ موسمی اثرات سے کھردرے ہو گئے تھے، گلے کا کنٹھا نمایاں طور پر ابھرا ہوا تھا اور آنکھوں سے تشویش جھلک رہی تھی۔

* * *

"بڑا اچھا ہوا جو آپ آ گئے" سلطنت نے جس کی نگاہیں مراد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، مسرت کے ساتھ کہا۔

"میرے والد کیسے ہیں؟" مراد نے پوچھا۔

"مجھے ان کے پاس جانے کی ہمت نہیں پڑی۔ ہم دونوں کے متعلق وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ میں نے دبکی سے ایک ڈاکٹر بلوایا تھا جس نے مجھے بتایا کہ آپ کے والد کی طبیعت بہتر ہے۔"

"لیکن انہیں ہوا کیا ہے؟"

"ضعیفی اور کیا۔ ہاں سنئے یہ رہی نئے چرکیئی کے گھر کی کنجی!" اس نے کنجی اپنے بیگ سے نکال لی۔ "اسے اپنی والدہ کو دے دیجئے گا۔"

"اور تم خود اپنے بارے میں کیا کہتی ہو؟ تم نے فیصلہ کر لیا نا؟"

"جی ہاں۔ میرے شوہر، میں ان علاقوں میں رہنے کی عادی ہو چکی ہوں لیکن اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو..." اس نے اپنا سر جھکا لیا اور خود اپنے گھر کی کنجی اسے دکھائی۔ "اسے کسی اور کو دے دیجئے۔"

"بہت اچھا۔ تم کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھیں؟"

"جی ہاں" سلطنت نے شرماتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تو کہو نا۔ مجھے اپنے والد کے پاس جانا ہے۔"

"تو جائیے، میں آپ کو بعد میں بتا دوں گی۔ والد کے پاس جائیے۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ آپ جائیے۔"

وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی، اسے یہ نہ بتا سکی کہ ان دونوں کے یہاں بچے کی ولادت ہونے جا رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ بعد میں بتا دے گی۔ اہمیت تو اس بات کی ہے کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے۔ وہ شہر جا کے اس کے ساتھ رہنے لگے گی۔

آخری ہدایت

عشورعلی لاغر اور نحیف بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ انسان کی اپنی ہڈیاں بھی اسے اتنی اذیت پہنچا سکتی ہیں، اس طرح دکھ سکتی ہیں۔ ضعیفی اسی کا نام ٹھہرا۔

مراد نے جلدی جلدی سیڑھیاں طے کیں اور اپنا ہلکا کوٹ ریلنگ پر ڈال دیا۔ ماں اسے برآمدے ہی میں مل گئی۔

"امی‌جان، انہیں ہو کیا گیا؟"

"وہی جو کسی ضعیف آدمی کو ہمیشہ ہو جاتا ہے" زازا نے روتے اور بیٹے کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ مراد نے سوچا کہ اس کی ماں کتنی پستہ‌قد، دبلی پتلی اور کمزور ہیں اور کمر تو اتنی زیادہ

کبھی بھی نہیں جھکی تھی۔ "انہوں نے اپنی ساری زندگی ایک سرکش آدمی کی طرح بسر کی" ماں نے بات جاری رکھی۔ "ساری بیماریاں اگر سر سے پیدا ہوتی ہیں تو حیرت کی بات ہے کہ انہیں ایسی طویل عمر ملی۔ دوسرے لوگوں کو اپنی اپنی فکر رہتی تھی لیکن وہ ہمیشہ دوسروں کی فکر کیا کرتے تھے۔"

"آپ کو میرے بھائیوں کی بھی کچھ خبر ملی؟ وہ لوگ آئیں گے کہ نہیں؟"

"نہیں، ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ تم سب کے بارے میں مجھ سے تین بار دریافت کر چکے ہیں۔ انہوں نے مجھے تو خوف‌زدہ کر دیا: مجھ سے سارے دریچے بند کرا دئے۔ کہنے لگے: تاریکی سے عادی ہونے کا وقت آ چکا ہے۔ میں کچھ بھی پکاؤں، وہ کھاتے ہی نہیں۔ اور آج انہوں نے اچانک کہا: "اگر کسی کو ہماری ضرورت نہیں، سب لوگ ہمیں چھوڑ کے چلے گئے ہیں تو آؤ، میرے پاس لیٹ جاؤ، دونوں ساتھ ساتھ دنیا سے کوچ کریں گے۔" اور میرے بیٹے، میں تیار بھی ہوں لیکن کوئی گائے دوہنے والا نہیں۔ ہمارے سب پڑوسی جا چکے ہیں۔"

"کون ہے؟" عشورعلی کی آواز اندر سے سنائی دی۔

"میں ہوں، اباجان!" مراد نے اندر پہنچ کے دریچے کو کھولا اور اپنے باپ کے پاس جا کے اس کا نحیف و ناتواں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "اباجان، آپ کو بیماری کیا ہے؟ زندگی میں کبھی آپ بیمار ہی نہیں پڑے اور آخر دن کے اجالے سے کیوں چھپ رہے ہیں؟"

"یکبارگی اتنے زیادہ سوالات، میرے بیٹے..." عشورعلی کو بےحد خوشی ہوئی کہ اس کا سب سے محبوب بیٹا آ گیا ہے اور اس نے اس کا ہاتھ بھینچ لیا۔ "بڑا اچھا ہوا جو تم آ گئے۔ بیٹے، میں نے تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔ کچھ اور قریب آ جاؤ نا۔"

اس وقت مصور نے بوڑھے کی تصویر کے لئے بالکل ہی مختلف رنگ منتخب کئے ہوتے: پھیکے ہلکے رنگ، سفید یا ہلکا زرد۔ عجیب بات ہے کہ موت سے قبل انسان کی ہر چیز سفید ہو جاتی ہے — بےجان سفید پیشانی، ٹھٹھری ہوئی سفید ناک، سفید داڑھی اور مونچھیں؛ کان کی لویں البتہ غیرفطری طور پر نیلی ہوتی ہیں۔ سفید تکیہ،

سفید چادر اور سفید گدا۔ صرف آنکھوں میں جان باقی رہ جاتی ہے جو حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی ادھر ادھر دیکھتی رہتی ہیں۔

"اباجان، مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو شہر لے چلوں۔ وہاں اچھے ڈاکٹر موجود ہیں۔"

"شکریہ بیٹے، لیکن اب تو اس کا وقت گزر چکا ہے۔ کرسی لے کے یہاں بیٹھ جاؤ تاکہ میں تمہارا چہرہ دیکھ سکوں — ہاں، اب ٹھیک ہے..."

"اباجان، آپ میرا کہنا مان لیجئے، میرے ساتھ شہر چلئے۔"

"بیٹے، اب تو مجھے ایک دوسرے راستے پر، ایک طویل راستے پر گامزن ہونا ہے جو دوام کو، ابدی سکون کی منزل کو جاتا ہے۔ تم میرے سب سے چھوٹے بیٹے ہو۔ تمہاری پیدائش میری ضعیفی پر رکھے جانے والے تاج کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور تم میرے دل کو سب سے زیادہ عزیز ہو" عشورعلی نے جو بہ‌دقت سانس لے رہا تھا، کہا۔

"اباجان، آپ تو مجھ سے پہچانے نہیں جا رہے ہیں۔ آخر یہ بات کیا ہے؟"

"ہاں، مجھے نہیں یاد پڑتا کہ اور کبھی اتنی کمزوری محسوس کی ہو۔ مجھے معاف کر دو بیٹے، بعض اوقات میں نے تمہارے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ سخت رویہ اپنایا ہے۔ اور اب میری بات سنو... میں تمہیں ان غلطیوں کے خلاف آگاہی دینا چاہتا ہوں جو مجھ سے میری زندگی میں سرزد ہوئی ہیں۔ تم میرے جیسے کردار کے مالک ہو۔ اس کی مجھے خوشی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ بےچینی سی بھی ہے۔ تم تیز مزاج اور ضدی ہو۔ اس طرح کا آدمی آخر میں اداس اور تنہا ہو کے رہ جاتا ہے اور لوگوں کے درمیان تنہا ہونے سے زیادہ دشوار بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس طرح کا کردار بہت سی مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کرتا ہے جن پر قابو پانے میں انسان کو بہت زیادہ قوت صرف کرنی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا رہا ہے کہ مجھے اس سلسلے میں اتنی زیادہ قوت ضائع نہ کرنی پڑتی تو میں نے زندگی میں اور بہت کچھ کر لیا ہوتا۔ اپنے افعال میں قوت فیصلہ کو اپنا رہبر بنانا اور لوگوں کی کمزوریوں کے سلسلے میں صبر و ضبط سے کام لینا..."

"اباجان، کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے لوگوں کی غلط باتوں کو معاف کر دینا چاہئے؟"

"نہیں، لیکن کوئی شخص ڈھلواں چٹان پر ٹھوکر کھا کے گرے تو اسے دھکا نہ دو بلکہ اٹھ کے کھڑے ہونے میں اس کی مدد کرو۔ لوگوں سے مل جل کے رہنا سیکھو اور ان کی خامیوں کے سلسلے میں صبر سے کام لو۔"

"لیکن اباجان، میں محض دکھاوے کے لئے کوئی بات نہیں کر سکتا۔"

"تو زندگی تمہارے لئے بہت دشوار ثابت ہوگی" اس کے باپ نے اس غم کے ساتھ کہ بیٹا اسے سمجھ نہیں پا رہا ہے، ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں آسان زندگی کا خواہاں بھی نہیں ہوں۔ زمین پر رینگنے سے مر جانا بہتر ہے۔ اباجان، آپ کو خیال ہے کہ یہ الفاظ کس کے ہیں؟"

"میرے ہیں لیکن تم انہیں فراموش کر دو۔"

"جی نہیں۔ خیر ہوگا اباجان، اس مسئلے پر اب بات ہی نہ کرنی چاہئے۔ آپ جیسے تھے ویسے ہی آخر دم تک رہئے۔ ورنہ مجھے آپ کی طرف سے مایوسی ہوگی" اور اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اچھا میرے بیٹے، تمہیں میں اپنی آخری ہدایت دے رہا ہوں۔"

"سن رہا ہوں، اباجان۔"

"مجھ سے جلدی نہ کراؤ۔"

"اباجان، میں دوسرے لوگوں کو بھی اندر بلا لوں گا۔"

"کوئی رہا ہی نہیں۔ سب کے سب مجھے چھوڑ کے جا چکے ہیں اور اب مجھے ان کی ضرورت بھی نہیں رہی۔"

"کیا آپ کسی سے الوداعی ملاقات نہیں کرنا چاہتے؟"

"نہیں!"

"آپ دعا کیوں نہیں مانگتے؟"

"میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔ میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ دنگیر — دنگارچو کمیونسٹ تھے لیکن آخری لمحات میں... میری بات پر یقین کرو میرے بیٹے، یہ بات خود میرے لئے بھی..."

"آپ کہنا چاہتے ہیں کہ غیرمتوقع تھی؟"

"ہاں۔"

"نہیں اباجان، یہ اس سے خراب تھی، یہ تو غداری تھی۔"

"تم بےرحمی سے رائے قائم کر رہے ہو۔ مجھے یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ لوگ فرماں‌بردار ہیں اور میرے کہنے پر عمل کریں گے... مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بات درست نہیں۔ دراصل مجھے ان کے کہنے پر عمل کرنا ہوگا..."

"آپ کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

"میری آخری ہدایت سنو، میرے بیٹے: مجھے اس نئی جگہ لے جا کے دفن کرنا، نئے قبرستان کا آغاز مجھ سے، ایک پرانے آدمی سے ہونا چاہئے۔"

"مجھے سخت حیرت ہے" مراد نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔

"اچھا اس سلسلے میں تمہارا کہنا کیا ہے؟ یہ بھی غداری ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم" وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"تم مجھ سے میرے فیصلے کا سبب کیوں نہیں دریافت کر رہے ہو؟ لیکن نہیں، تم ویسے بھی نہ سمجھ پاؤگے۔ شاید میں اپنے دوست دنگیر – دنگارچو کی غلطی کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا کرنے کا حق ہے کہ نہیں؟"

اتنے میں دروازہ کھلا اور گاؤں کے بڑے بوڑھے داخل ہوئے جن میں امیرخان اور لنگڑا عثمان بھی شامل تھے۔ انہوں نے مراد سے مصافحے کر کے اس کی آمد پر اظہار پسندیدگی کیا۔ عشورعلی کو حیرت اور مسرت ہوئی کیونکہ اس نے سوچا تھا کہ سب لوگ اس سے رخصت ہوئے بغیر ہی جا چکے ہیں۔

"میرے دوستو، تم نے اس وقت آ کے اچھا کیا، بہت ہی اچھا کیا" عشورعلی نے کہا۔

"ہمارے پرانے دوست، تمہیں معلوم ہے کہ گاؤں میں بس ہم لوگ ہی باقی رہ گئے ہیں؟"

"دوسرے سب لوگ جا چکے؟"

"ہاں، سب کے سب۔"

"تو تم لوگ کیوں رہ گئے؟"

"تمہارے بغیر ہم کیسے جا سکتے تھے۔"

"شکریہ۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ سچ نہیں، پھر بھی اسے

سن کے خوشی ہوئی۔ کل شام کو تم لوگ مجھے وہاں، نئے قبرستان میں دفن کروگے۔ میں اپنے بیٹے کو اس معاملے میں وصیت کر چکا ہوں۔ نئے قبرستان کا مجھ سے، ایک پرانے آدمی سے آغاز ہونے دو۔ سن رہے ہو نا، نئے چرکیئی کے معزز لوگو؟"

"لیکن عشورعلی، اس کے متعلق بھلا ابھی کون سوچ رہا ہے؟" لوگوں نے بےچینی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اچھا میرے بیٹے، اب تم جاؤ اور مجھے ان معزز بڑے بوڑھوں کے ساتھ چھوڑ دو۔ اچھا الوداع۔ لاؤ، ایک بار پھر تمہارے ہاتھ کو تھام لوں۔ میرے گلے سے لگ جاؤ۔ لیکن بہت سنبھال کے ورنہ میں کہیں ٹوٹ کے نہ رہ جاؤں۔ زور سے نہ دبانا ورنہ تکلیف ہوگی۔ ہاں، یوں ٹھیک ہے۔ شکریہ، الوداع!"

"الوداع، اباجان!"

پہاڑوں میں دن اور رات کے تمام اوقات میں سب سے پراسرار اور تخیل کو قوت پرواز عطا کرنے والا علی‌الصباح کا، طلوع آفتاب سے ذرا قبل کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کچھ عجب جوش و خروش محسوس کرتے ہیں اور ہزاروں غیروضاحت‌شدہ پراسرار باتوں کو معلوم کرنے کے لئے آپ کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ قدرت... قدرت مسحور کر دینے والے کتنے زیادہ رازوں کو چھپائے ہوئے ہے اور اس کی بےرحمی تک میں ایک خاص آن، ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔ آپ کو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گھاس کے ہر تنکے میں، شبنم کے قطروں کو پنکھڑیوں سے جھڑک دینے کے لئے بیدار ہوتے ہوئے ہر پھول میں، ڈھلانوں پر اپنا نیلگوں رومال پھیلاتے اور گھاٹیوں میں اکٹھا ہوتے کہرے میں اور اپنی برادری کے معاملات میں مصروف ایک ایک چیونٹی میں خود آپ کی ذات کا بھی بہت ہی ننھا سا جزو شامل ہے۔ خود کو اس سب کا ایک چھوٹا سا جزو محسوس کرنا کسی عجوبے، کسی معجزے سے کم نہیں۔ ایک ایسا جزو جو رازوں کی کھوج کرنے والے ذہن کا بھی مالک ہے۔ آپ پر یہ ساری کیفیت چیکا – سیزل – میئر کوہساروں میں خاص طور سے بڑی شدت سے طاری ہوتی ہے جہاں ایک نیا انسان جنم لے رہا ہے۔ انسان جس

نے اس عظیم‌الشان باندھ اور اس بجلی گھر کی تعمیر کی ہے۔ محنت‌کش انسان جس نے ارضی آفتاب کی تخلیق کی ہے اور کہستانی دریا کے پانی کو روک کر اس کی قوت سے کام لیا ہے۔

چیکا – سیزل – میئر کوھساروں پر ایک نیا دن طلوع ہو رہا ہے جو گزشتہ تمام برسوں اور صدیوں کے کسی دوسرے دن جیسا نہیں ہے۔ طلوع ہوتے ہوئے عظیم آفتاب کے سامنے ایک انسان باندھ پر کھڑا، اپنے ہاتھوں کے کارنامے کو سراہ رہا ہے۔ وہ ایک گلےبان کا پرپوتا، ٹین کا کام کرنے والے ایک مستری کا پوتا اور ایک لوھار کا بیٹا ہے۔ یہ شخص دھرتی پر مضبوطی اور صداقت کے ساتھ قدم جما کے کھڑے ہونے اور اپنی تیز نگاھوں سے دوریوں کی کھوج کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ آفتاب اس کے چہرے پر نور برسا رہا ہے، اس کی حیثیت ایک یادگار جیسی، ذھن انسانی کی فتح کی علامت جیسی ہے۔ وہ کرمچ کے دستانے سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہے، اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے جیسے بلند آواز سے کہنا چاھتا ہو: "کوھسارو، چوٹیو، میں تمہیں سلام کرتا ہوں! تم خوبصورت ہو اور میں تمہیں کچھ اور زیادہ خوبصورت بنانے آیا ہوں!"

ایک انسان پرومیتھوس کی طرح، ھمارے دور اور آزاد حوصلے کا مادی شکل میں اظہار بنا ہوا کھڑا ہے جیسے وہ اپنے خوابوں تک پہنچنے کے لئے آفتاب کی شعاعوں کے ان‌دیکھے راستے پر تیزی سے گامزن ہونے کو تیار ہو۔

اس کے اوپر آسمان نیلا اور ناقابل ادراک ہے۔

صبح کا عظیم آفتاب، موسم بہار کا آفتاب، مہربان آفتاب چیکا – سیزل – میئر کوھساروں میں طلوع ہو رہا ہے جہاں ایک دوسرا آفتاب انسان کا تخلیق کیا ہوا آفتاب – چرکیئی پن بجلی گھر جنم لے رہا ہے۔

"عقاب نشیمن" میں آفتاب۔
انسان آفتاب کی طرف نہیں دیکھا کرتا۔
اس کا عکس اپنے دل میں تلاش کرتا ہے۔
یہ مل جاتا ہے تو وہ مسرتوں سے ھمکنار ہو جاتا ہے!

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے متعلق آپ کی قیمتی رائے اور آئندہ مطبوعات کی تجاویز اور مشوروں کا بصد شکریہ خیرمقدم کرے گا۔

براہ کرم اپنے تبصرے اور مشورے مندرجہ ذیل پتے پر بھیجئے:

دارالاشاعت ترقی کی شاخ
۳۰۔ نوائی اسٹریٹ
تاشقند – سوویت یونین

Progress Publishers Branch
30, Navoi Street,
Tashkent, USSR

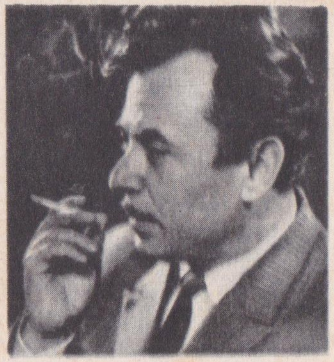

یہ ناولٹ بلند کوهساروں پر ایک پن بجلی گھر کی تعمیر اور اس کے معماروں سے متعلق ہے۔

دور دراز علاقے میں واقع گاؤں چرکیئی میں جو کہستانی بلندیوں پر عقاب کے نشیمن کی طرح چمٹا ہوا ہے، پہلے ارضی تفتیش کرنے والے پہنچتے ہیں پھر تعمیراتی کارکن...

اور اس طرح گاؤں کی عام، صدیوں سے ایک ہی ڈھرے پر چلنے والی پرسکون زندگی میں خلل پڑ جاتا ہے۔ یہاں نئی زندگی کس طرح جنم لیتی ہے، یہ نئی زندگی اپنے تیز دھارے میں خوبصورت خاتون سلطنت کی قسمت کو، اس کے محبوب مراد کی قسمت کو، مراد کے باپ اور گاؤں کے معززترین بزرگ عشورعلی کی قسمت اور دوسرے نوجوان اور معمر افراد کی قسمت کو کس طرح شامل کر لیتی ہے – اس سب کی سوویت داغستان کے مشہور مصنف احمدخان ابو بکر نے بڑی تفصیل کے ساتھ عکاسی کی ہے۔

احمدخان ابو بکر جنہیں ان کی جمہوریہ نے عوامی مصنف کے خطاب سے نوازا ہے، بلند پہاڑوں پر واقع گاؤں کباچی میں سناروں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی تصانیف میں عہدحاضر کے داغستان کو، ملک کی اجتماعی زندگی اور لوگوں کی نفسیات اور ان کے طرز حیات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان کا انداز بیان شاعرانہ ہے اور ان کی نثر مادروطن اور ہموطنوں کے لئے محبت کے جذبات سے معمور ہے۔ ان کی کتابوں سے ہمدردانہ ظرافت اور صحت‌مند اداسی جھلکتی ہے۔